الرسالہ

سرپرست
مولانا وحید الدین خان

اگر آپ عمل میں کم ہوں تو _____
زیادہ الفاظ بول کر آپ اس کی تلافی نہیں کر سکتے

شمارہ ۵۳
اپریل ۱۹۸۱

زر تعاون سالانہ ۲۴ روپے
خصوصی تعاون سالانہ ایک سو روپے
بیرونی ممالک سے ۱۵ ڈالر امریکی

قیمت فی پرچہ
دو روپے

الرسالہ

اپریل ۱۹۸۱

شمارہ ۵۳

جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ دھلی ۱۱۰۰۰۶ (انڈیا)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اعلان

مولانا وحید الدین خاں صاحب کی کئی کتابیں لکھ کر تیار ہیں مگر سرمایہ کی کمی کی وجہ سے چھپنے کے لئے رکی ہوئی ہیں۔ اس سلسلے میں ایک تجویز یہ ہے کہ کچھ لوگ بطور قرض سرمایہ فراہم کر دیں۔ تاکہ اس کے ذریعہ سے کتابوں کی اشاعت کا انتظام کیا جا سکے۔

جو لوگ قرض کی اس اسکیم میں حصہ لیں گے ان کے اطمینان کے لئے عرض ہے کہ جب بھی وہ اپنی رقم واپس لینا چاہیں گے انشاء اللہ پوری ذمہ داری کے ساتھ ان کی رقم انھیں واپس کر دی جائے گی۔

——— مکتبہ الرسالہ

منی آرڈر کوپن پر اپنا پورا پتہ تحریر فرمائیں۔ ہر خط و کتابت کے ساتھ خریداری نمبر یا ایجنسی نمبر کا حوالہ ضرور دیں

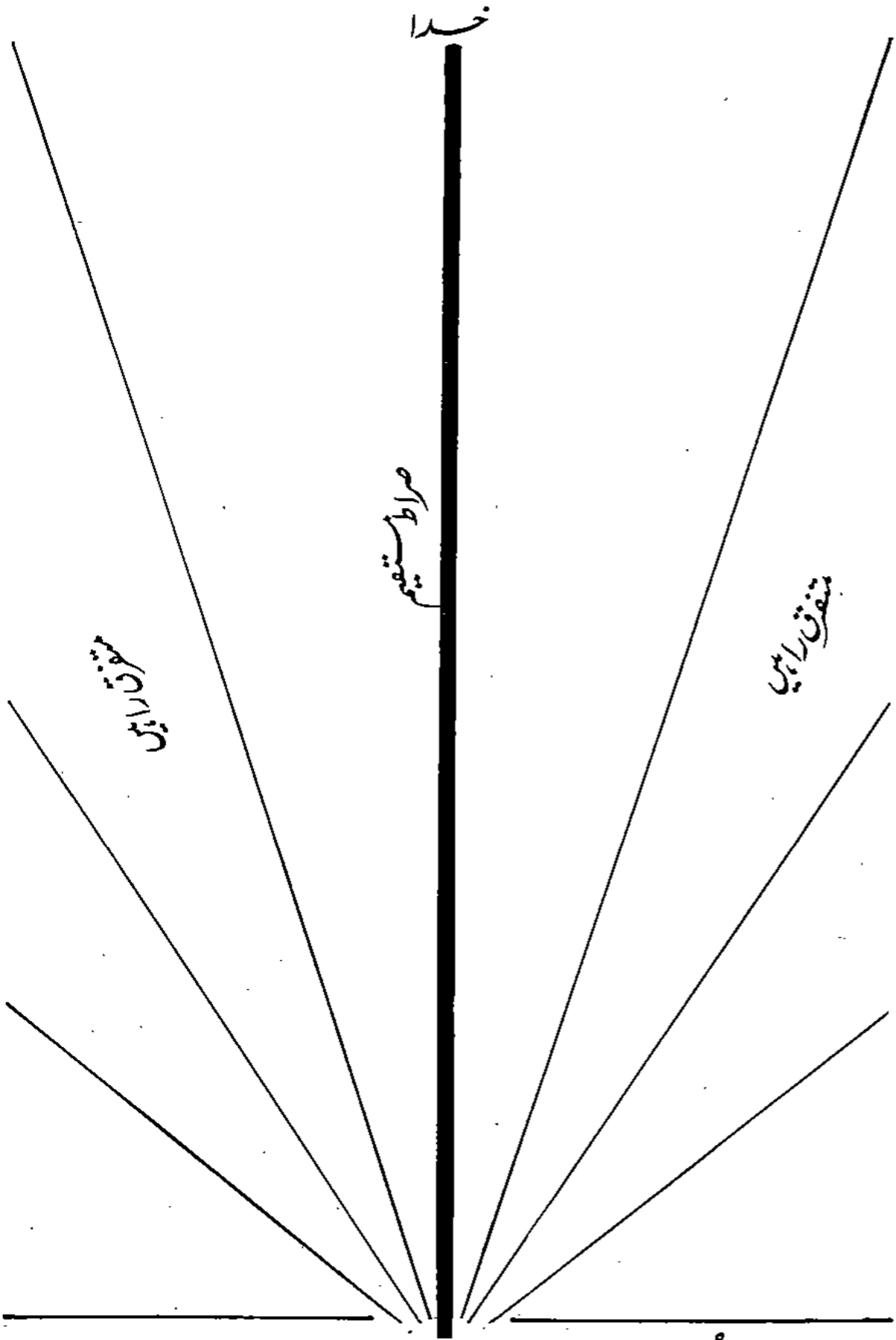

اِنَّ رَبِّیْ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ (بے شک میرا رب سیدھی راہ پر) یعنی جو سیدھی راہ چلے وہ اس سے ملے (شاہ عبدالقادر)

رخ سے بے رخ ہونا

ہر کام کے کرنے کا ایک صحیح رخ ہوتا ہے اور ایک غلط رخ۔ آدمی صحیح رخ پر چل کر منزل پر پہنچتا ہے اور غلط رخ پر چل کر اِدھر اُدھر بھٹک جاتا ہے۔ مثلاً تجارت میں کامیابی کا راز محنت اور دیانت داری ہے۔ اب تاجر کے لئے عمل کا صحیح رخ یہ ہوگا کہ وہ محنت اور دیانت کا ثبوت دے کر تجارتی کامیابی حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ یہ تاجر کا صحیح تجارتی رخ پر چلنا ہے۔ اور جو شخص صحیح رخ پر چلے وہ ضرور ایک نہ ایک دن کامیاب ہوگا۔ اس کے برعکس اگر وہ یہ کرے کہ بازار کے دوسرے تاجروں کی بربادی پر اپنی تجارتی ترقی کی بنیاد رکھنا چاہے۔ یا بینکوں میں ڈاکہ ڈال کر آناً فاناً کروڑ پتی بننے کا خواب دیکھے۔ یا تجارت کے نام پر جلسہ جلوس اور احتجاج اور مطالبہ کی مہم چلائے اور سمجھے کہ اس طرح وہ اپنی تجارتی منزل پر پہنچ جائے گا تو یہ سب اس کے لئے غلط رخ پر بھٹکنے کی صورتیں ہوں گی۔ ایسا تاجر کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ یہ تمام صورتیں کسی تاجر کے لئے رخ سے بے رخ ہونے کی صورتیں ہیں اور جو شخص رخ سے بے رخ ہو جائے اس کے لئے اس دنیا میں کوئی کامیابی نہیں۔

یہی معاملہ دین کا بھی ہے۔ دین کی بھی ایک صراط مستقیم ہے اور ایک اس میں بھٹکنے کے راستے ہیں۔ صراط مستقیم پر چلنے کو قرآن میں اقامت دین کہا گیا ہے اور اِدھر اُدھر کے راستوں میں بھٹکنے کو تفرق فی الدین (شوریٰ) دین کی صراط مستقیم پر قائم ہونا یہ ہے کہ آدمی ایک اللہ کو اپنا سب کچھ بنائے، اسی سے سب سے زیادہ ڈرے اور اسی سے سب سے زیادہ محبت کرے۔ اس کو سب سے زیادہ فکر آخرت کی ہو۔ وہ ہر معاملہ کو آخرت کے نقطۂ نظر سے دیکھتا ہو۔ اس کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہو کہ وہ جہنم کے عذاب سے بچ جائے اور اس کی سب سے بڑی طلب یہ ہو کہ خدا اس کو جنت میں داخل کرے۔ وہ دنیا میں ذمہ دارانہ زندگی گزارے۔ لوگوں کے ساتھ معاملہ کرنے میں اس کا رویہ احتیاط اور تقویٰ کا رویہ ہو نہ کہ آزادی اور بے قیدی کا۔ یہ دین کا سیدھا راستہ ہے۔ جو اس پر چلے گا وہ لازماً خدا کو پائے گا اور اس کی رحمت و نصرت میں حصہ دار بنایا جائے گا۔

اس کے برعکس دین میں متفرق ہونا یہ ہے کہ دین کا کوئی لفظ بول کر ایک غیر متعلق قسم کی دھوم مچائی جائے۔ مثلاً توحید کا نام لے کر اس قسم کی بحثیں شروع کر دی جائیں کہ خدا جسمانی وجود ہے کہ روحانی وجود۔ وہ صرف عادل ہے یا ظلم پر بھی قادر ہے۔ وغیرہ۔ یا عبادت کا نام لے کر فضائل عبادت کی طلسماتی کہانیاں سنائی جانے لگیں یا مسائل عبادت میں فنی موشگافیاں کر کے نئی نئی لامتناہی بحثوں کا آغاز کر دیا جائے۔ کوئی اسلام کے نظام عدل کو قائم کرنے کے نام پر "ظالم حکمرانوں" کو اقتدار سے بے دخل کرنے کے لئے اکھیڑ پچھاڑ شروع کر دے۔ کوئی یہ نظریہ بنائے کہ اسلام ایک مکمل نظام ہے۔ اور مکمل نظام سیاسی اقتدار کے بغیر قائم نہیں ہو سکتا۔ اس لئے سب سے پہلا کام حکومت پر قبضہ کرنا ہے۔ یہ کہہ کر وہ سارے دین کو سیاست بازی کے رخ پر چلا دے۔ اس قسم کی تمام صورتیں دین کی صراط مستقیم سے بھٹکنے کی صورتیں ہیں۔ وہ قرآن کے الفاظ میں تفرق فی الدین ہے نہ کہ اقامت دین (شوریٰ ۱۳)

سچائی کا زور

ابن ہشام نے نقل کیا ہے کہ مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے پہلے جس نے لوگوں کے سامنے بآواز بلند قرآن پڑھا وہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تھے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب ایک روز جمع ہوئے۔ انھوں نے کہا: خدا کی قسم قریش نے ابھی تک اس قرآن کو بلند آواز سے نہیں سنا۔ کیا کوئی ہے جو قریش کے لوگوں کو قرآن سنائے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے کہا، میں سناؤں گا۔ عبداللہ بن مسعود دبلے اور کمزور جسم کے تھے۔ مکہ میں ان کا کوئی قبیلہ بھی نہ تھا جو ان کی حمایت کرے۔ وہ اس وقت لوگوں کی بکریاں چراتے تھے اور "ابن ام عبد" کے نام سے جانے جاتے تھے۔ چنانچہ آپ کے ساتھیوں نے کہا کہ تمھارے بارے میں ہمیں ڈر ہے۔ اس کام کے لئے ہم ایسا آدمی چاہتے ہیں جس کا مکہ میں قبیلہ ہو اور قریش جب اس پر حملہ کریں تو اس کا قبیلہ قریش کو روکے۔ عبداللہ بن مسعود نے کہا: مجھے جانے دو، کیونکہ اللہ میری مدد کرے گا۔

حضرت عبداللہ بن مسعود روانہ ہوئے اور اس مقام پر پہنچے جہاں قریش کے لوگ جمع تھے۔ وہ ان کے پاس کھڑے ہو گئے۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم کہا اور اس کے بعد بلند آواز سے سورہ رحمٰن پڑھنا شروع کیا۔ وہ پڑھتے رہے یہاں تک کہ قریش نے آپس میں پوچھنا شروع کیا کہ یہ "ابن ام عبد کیا پڑھ رہا ہے"، کسی نے کہا کہ یہ اس کلام کا کوئی حصہ ہے جو محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) پر اترا ہے۔ یہ سن کر وہ اٹھے اور عبداللہ بن مسعود کے منھ پر مارنا شروع کیا۔ تاہم وہ برابر پڑھتے رہے۔ اس کے بعد جب عبداللہ بن مسعود اپنے ساتھیوں کے پاس واپس آئے تو ان کے چہرے پر مار کا نشان ظاہر ہو چکا تھا۔ لوگوں نے دیکھ کر کہا: تمھارے بارے میں ہم کو اسی کا اندیشہ تھا۔ عبداللہ بن مسعود نے کہا: خدا کے دشمن آج مجھ کو جتنا کمزور معلوم ہوئے اتنا کمزور مجھے کبھی معلوم نہیں ہوئے تھے اور اگر تم چاہو تو کل پھر میں اسی طرح جا کر ان کو قرآن سناؤں گا (ما اعداء اللہ اھون علیّ منھم الآن ولئن شئتم لأغادینّھم بمثلھا غدا، سیرۃ ابن ہشام، جزء اول، صفحہ ۳۲۷)

ایک کمزور اور بے سہارا آدمی کے اندر یہ قوت کہاں سے آئی کہ وہ کسی مادی تحفظ کے بغیر دشمنوں کے مجمع میں گھس گیا اور ان کو بلند آواز سے وہ کلام سنانے لگا جس کا سننا ان کو سب سے زیادہ ناگوار تھا۔ اس قوت کا راز سچائی پر یقین ہے۔ عبداللہ بن مسعود کو کامل یقین تھا کہ وہ حق پر ہیں اور قریش باطل پر۔ قریش نے جب عبداللہ بن مسعود کو مارنا شروع کیا تو ان کا یقین اور بڑھ گیا۔ کیوں کہ ان کے دل نے کہا کہ قریش کے پاس دلیل کی زبان میں ان کے جواب کے لئے کچھ نہیں ہے۔ ان کی جارحیت صرف اس بات کا ثبوت

تھی کہ دلیل کے میدان میں وہ اپنے کو بالکل بے بس پا رہے ہیں، عبداللہ بن مسعود سچائی کے زور سے زور آور تھے، اور یقیناً سچائی کا زور سب سے بڑا زور ہوتا ہے۔

دنیا کی رزم گاہ میں بہادر بننے کا راز یہ نہیں ہے کہ آدمی پر مشکلات نہ گزریں۔ مشکلات تو اس دنیا میں ہر ایک کے لئے آتی ہیں۔ بہادری کا اصل راز یہ ہے کہ آدمی کے پاس کوئی ایسا یقین ہو جو اپنے مقصد کے مقابلہ میں مشکلات کو اس کے لئے حقیر بنا دے۔ دکھوں کی اس دنیا میں مشکلات کو وہی شخص جھیلتا ہے جس کو مشکلات سے بڑی کوئی چیز مل گئی ہو۔

مومن کو یہ چیز کمال درجہ میں حاصل ہوتی ہے۔ اس کے پاس ایک ایسا حق ہوتا ہے جس کی عظمت اور صداقت پر اسے ادنیٰ شبہ نہیں ہوتا۔ مزید یہ کہ اسے یقین ہوتا ہے کہ اس راہ میں ہر قربانی آخرت میں اس کی کامیابیوں میں اضافہ کرنے کے ہم معنی ہوگی۔ یہ یقین اس کے لئے حق کے اعلان کو ایک ایسی لذت بنا دیتا ہے جس کا سرور کبھی ختم نہ ہو۔ مخالفین کی جارحیت صرف اس کے اس یقین میں اضافہ کرتی ہے کہ وہ سراسر حق پر ہے اور اس کے مخالفین سراسر باطل پر۔ جارحیت در اصل سچائی کے میدان میں اپنی شکست کا اعلان ہے۔ مخالفین کی جارحیت ایمان و اسلام کے داعی کے لئے اس بات کا ثبوت ہوتی ہے کہ اس کے مخالفین دلیل کے میدان میں اپنی بازی ہار چکے ہیں۔ کیوں کہ جس کے پاس دلیل کی طاقت ہو وہ کبھی جارحیت کی طاقت استعمال نہیں کرتا۔

سچائی ایک اعلیٰ ترین ذہنی یافت ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سچائی کی طاقت کا خزانہ آدمی کے اپنے اندر ہوتا ہے۔ جب کہ دوسری تمام طاقتیں خارجی طاقتیں ہیں، ان کا خزانہ آدمی کے اپنے وجود کے باہر ہوتا ہے۔ دوسری طاقتوں کا ذخیرہ محدود ہوتا ہے۔ وہ کسی نہ کسی وقت ختم ہو جاتا ہے۔ یہ چیزیں نازک حالات میں خود اپنے بچاؤ کی فکر میں لگ جاتی ہیں، اس بنا پر وہ نازک مواقع پر آدمی کا ساتھ چھوڑ دیتی ہیں۔ مگر سچائی کا معاملہ بالکل مختلف ہے۔ سچائی وہ اتھاہ طاقت ہے جس کا ذخیرہ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ سچائی جب ایک بار کسی کو مل جائے تو وہ اس کی جان کے ساتھ ساتھ باقی رہتی ہے، وہ کسی حال میں اس سے جدا نہیں ہوتی۔ سچائی کی طاقت آخر وقت تک آدمی کا سہارا بنی رہتی ہے۔ حتیٰ کہ اس وقت بھی جب کہ بظاہر اس کے ساتھ کوئی طاقت موجود نہیں ہوتی۔

مومن کو جو سچائی ملتی ہے وہ خود خدا ہوتا ہے۔ مومن خدا کو سب سے بڑی حقیقت کے طور پر پا لیتا ہے۔ پھر جو سب سے بڑی ہستی کو پائے وہ اس کے بعد کسی چھوٹی چیز سے کیوں ڈرے گا۔ اس کے بعد کوئی چیز پانے کے لئے باقی ہی نہیں رہتی۔

حقیقت کی تلاش

گلیلیو (۱۶۴۲ - ۱۵۶۴) اپنی سادہ دوربین سے چاند کا صرف سامنے کا رخ دیکھ سکتا تھا۔ آج کا انسان خلائی جہازیں لگے ہوئے دوربینی کیمروں کی مدد سے چاند کا پچھلا رخ بھی پوری طرح دیکھ رہا ہے۔ یہ ایک سادہ سی مثال ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کل اور آج میں علمی اعتبار سے کتنا زیادہ فرق ہو چکا ہے۔

مگر ان جدید معلومات تک پہنچنے کی قیمت بہت مہنگی ہے۔ ۱۰ اکتوبر ۱۹۸۰ کو نیو میکسیکو میں دنیا کی سب سے بڑی دوربین نصب کی گئی۔ اس کی قیمت ۷۸ ملین ڈالر تھی۔ امریکا کا ایک خلائی جہاز (وائجر) جو دسمبر ۱۹۸۰ میں زحل پر پہنچا اس کی لاگت ۳۴ ملین ڈالر تھی۔ یورپ میں پارٹیکل فزکس کی بین اقوامی لیبورٹری (Cern) ۱۹۸۱ میں مکمل ہوئی ہے، اس کا مقصد اینٹی میٹر کو توڑ کر میٹر میں تبدیل کرنا ہے، اس لیبورٹری کی لاگت ۱۲۰ ملین ڈالر ہے۔ یہ ادارہ ایک اور زیادہ بڑی تحقیقی مشین تیار کرنے کا منصوبہ بنا رہا ہے جس کی لاگت ۵۰۰ ملین ڈالر ہوگی۔ پروٹان کی تحقیق کے لئے امریکہ میں ایک مشین بنائی گئی ہے جس کی لاگت ۲۷۵ ملین ڈالر ہے، وغیرہ

پارٹیکل فزکس (ذراتی طبیعیات) میں لوگوں کی بڑھتی ہوئی دلچسپی کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ ۱۹۲۷ میں ہونے والی فزکس کانفرنس میں ۳۲ سائنس داں شریک ہوئے تھے جب کہ ۱۹۸۰ میں ہونے والی فزکس کانفرنس میں شریک ہونے والے سائنس دانوں کی تعداد ۸۰۰ تھی۔ امریکن فزیکل سوسائٹی کے ممبروں کی تعداد ۱۹۲۰ میں ۱۳۰۰ تھی، ۱۹۸۰ میں اس سوسائٹی کے ممبروں کی تعداد ۳۰۰۰۰ تک پہنچ چکی ہے۔

ان جدید تحقیقاتی کوششوں کا تعلق فلکیات (اسٹرانومی) اور پارٹیکل فزکس (ذراتی طبیعیات) سے ہے۔ ان علوم میں تحقیقات کے نتائج بہت دیر میں نکلتے ہیں۔ تقریباً ۵۰ سال بعد یا اس سے بھی زیادہ۔ اگر اس کا لحاظ کیا جائے کہ ان تحقیقات میں لگی ہوئی رقم (جس پر کوئی سود نہیں ملتا) کی قیمت ہر سال کم ہوتی رہتی ہے تو پچاس سال بعد ایک سو ڈالر کی قیمت صرف ایک ڈالر کے بقدر رہ جائے گی۔ بظاہر ایک بے فائدہ مد میں اتنی کثیر رقم خرچ کرنے کی وجہ سے بہت سے لوگ ایسے منصوبوں پر اعتراض کر رہے ہیں۔ اس کا جواب دیتے ہوئے امریکی پروفیسر راجر پنروز (Roger Penrose) نے کہا ہے:

> Do economists not share with us the thrill that accompanies each new piece of understanding? Do they not care to know where we have come from, how we are constituted, or why we are here? Do they not have a drive to understand, quite independent of economic gain? Do they not appreciate the beauty in ideas? — A civilisation that stopped inquiring about the universe might stop inquiring about other things as well. A lot else might then die besides particle physics.
>
> SUNDAY Weekly (Calcutta) November 30, 1980

کیا اقتصادیات کے ماہرین اس وجد انگیز مسرت میں ہمارے ساتھ شریک نہیں ہیں جو علم کے ہر نئے اضافہ سے حاصل

ہوتی ہے۔ کیا ان کو یہ جاننے کا شوق نہیں ہے کہ ہم کہاں سے آئے ہیں، ہماری پیدائش کیسے ہوئی ہے یا یہ کہ اس زمین پر ہم کیوں ہیں۔ کیا اقتصادی فائدہ سے ہٹ کر ان باتوں کو جاننے کا جذبہ ان کے اندر پیدا نہیں ہوتا۔ کیا وہ نظریات میں حسن کی قیمت کو نہیں سمجھتے۔ کوئی تہذیب جو کائنات کے بارے میں تحقیق سے رک جائے وہ دوسری چیزوں کے بارے میں تحقیق کو بھی روک دے گی۔ اس کے بعد پارٹیکل فزکس کے علاوہ دوسری بہت سی چیزیں بھی موت کا شکار ہوکر رہ جائیں گی۔

اس اقتباس سے اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی کی حقیقت جاننے کا مسئلہ کس قدر ضروری ہے۔ وہ انسان جو خدا کی بنیاد پر کائنات کی تشریح نہیں کرنا چاہتا وہ بھی انتہائی بے تاب ہے کہ وہ کوئی ایسی چیز پائے جس کی بنیاد پر وہ اپنی اور کائنات کی تشریح کر سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ نظر آنے والی کائنات اور اس کے اندر انسان جیسی ایک مخلوق کا موجود ہونا اس قدر حیران کن ہے کہ انسان اس کی ماہیت کے بارے میں سوچے بغیر نہیں رہ سکتا۔ کوئی بھی دوسری چیز اس کو اس سوال سے بے نیاز کرنے والی ثابت نہیں ہو سکتی۔ حتی کہ بڑی بڑی مادی ترقیاں بھی۔

انسان دیکھتا ہے کہ وہ ایک لامحدود کائنات میں ہے۔ اس کائنات میں تقریباً ایک کھرب کہکشائیں ہیں۔ ہر کہکشاں میں لگ بھگ ایک کھرب بہت بڑے بڑے ستارے ہیں۔ اور ہر ستارہ دوسرے ستارے سے اتنا زیادہ فاصلہ پر ہے جیسے بحر الکاہل کے لق و دق سمندر میں چند کشتیاں ایک دوسرے سے بہت دور دور تیر رہی ہوں۔ عظیم کائنات میں پھیلے ہوئے ستاروں کی یہ تعداد اتنی زیادہ ہے کہ اگر ہر ستارہ کا کوئی یک لفظی نام رکھا جائے اور کوئی ان ناموں کو بولنا شروع کرے تو صرف تمام ناموں کو دہرانے کے لئے ۳۰ کھرب سال کی مدت درکار ہوگی (پلین ٹرتھ جنوری ۱۹۸۱)

اس ناقابل قیاس حد تک عظیم کائنات میں انسان سب سے زیادہ حقیر مخلوق ہے۔ وہ کائناتی نقشہ میں ان چھوٹے جزیروں سے بھی کم ہے جو بہت چھوٹے ہونے کی وجہ سے عام طور پر دنیا کے نقشوں میں دکھائی نہیں دیتے۔ یہ انسان اپنے تمام چھوٹے پن کے باوجود کائنات کے فاصلوں کو ناپ رہا ہے۔ وہ طبیعیاتی ذروں سے لے کر کہکشانی نظاموں تک کی تحقیق کر رہا ہے۔ وہ ایک ایسا ذہن رکھتا ہے جو ماضی اور مستقبل کا تصور کر سکے۔ یہ سب کیوں ہو رہا ہے اور کیسے ہو رہا ہے۔ اور بالآخر اس عجیب و غریب ڈرامے کا کیا انجام ہونے والا ہے۔ یہ سوالات ہر سوچنے والے انسان کے اوپر منڈلا رہے ہیں۔ وہ ان کی حقیقت تک پہنچنا چاہتا ہے۔ مگر انسان کی بدقسمتی یہ ہے کہ وہ ان سوالات کا جواب دوربینی مشاہدات اور لیبوریٹری کے تجربات میں ڈھونڈ رہا ہے۔ حالاں کہ ان سوالات کا جواب پیغمبر کے الہام کے سوا کہیں اور موجود نہیں۔

جس کائنات میں اتنی زیادہ دنیائیں ہوں کہ صرف ان کا نام لینے کے لئے تین سو کھرب سال سے زیادہ مدت درکار ہو، اس کی حقیقت کو وہ انسان کیوں کر دریافت کر سکتا ہے جو پچاس سال یا سو سال زندگی گزار کر مر جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خالق ہی اس راز کو کھول سکتا ہے اور اسی نے پیغمبر کے ذریعہ اس کو کھولا ہے۔

ختم نبوت

پیغمبر عربی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری رسول تھے۔ آپ کے بعد اب کوئی رسول نہیں آئے گا، یہاں تک کہ قیامت آجائے۔

اللہ کی طرف سے جتنے رسول آئے سب ایک ہی دین لے کر آئے۔ ان کے بولنے کی زبانیں الگ الگ تھیں مگر دین سب کا ایک تھا۔ مگر پچھلے نبیوں کی تعلیمات کو ان کے ماننے والے ان کی اصلی حالت میں محفوظ نہ رکھ سکے۔ یہی وجہ ہے کہ بار بار پیغمبر آتے رہے تاکہ خدا کے دین کو از سر نو تازہ اور زندہ کر دیں۔ مگر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ایسا انقلاب آیا جس نے دین کو اس کی اصلی حالت میں محفوظ کر دیا۔ اس لئے اب نیا پیغمبر آنے کی ضرورت باقی نہیں رہی۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ خدا کا دین اس طرح قائم ہو گیا جو آپ کے بعد ہر دور میں پیغمبر کا بدل بن سکے۔ خدا کی کتاب ویسی ہی کی ویسی محفوظ ہے جیسی کہ وہ آسمان سے اتری تھی۔ حتیٰ کہ اب پریس کے دور میں چھپ کر وہ دنیا بھر میں ہر آدمی تک پہنچ گئی۔ رسول کی زندگی ایک کامل نمونہ کی حیثیت سے مستند کتابی مجموعوں میں مرتب ہو گئی۔ رسول کے بعد ایک ایسی مستقل امت وجود میں آگئی جو نسل در نسل قرآن و سنت کے علم کو لوگوں تک پہنچاتی رہے اور اسی کے ساتھ دین کے طریقوں (مثلاً نماز کیسے پڑھی جائے) کو اس طرح عملی طور پر بتاتی رہے کہ کسی کو اس کی تعمیل میں دشواری نہ رہے۔ ہر دور کا انسان دین کو ٹھیک اسی طرح پاتا رہے جس طرح رسول کے زمانہ کے انسانوں کو وہ رسول کے ذریعہ ملا تھا۔

جب دین محفوظ ہو گیا اور لوگوں کے درمیان ہمیشہ کے لئے اس کا تسلسل قائم ہو گیا تو اب نیا نبی آنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اب خدا کی کتاب اور رسول کی سنت کے ذریعہ وہ کام ہوتا رہے گا جو پہلے رسول کے ذریعہ انجام پاتا تھا۔ پہلے یہ کام براہ راست رسولوں کے ذریعہ ہوتا تھا، اب وہ رسول کی امت کے ذریعہ ہوگا۔

قیامت

ہر روز رات کے بعد دن آتا ہے۔ جو چیزیں رات کے وقت اندھیرے میں چھپی ہوئی تھیں وہ دن کے اجالے میں ایک ایک کرکے سامنے آجاتی ہیں۔ اسی طرح موجودہ دنیا کے بعد آخرت کی دنیا آئے گی۔ اس وقت تمام حقیقتیں دن کی روشنی کی طرح کھل جائیں گی۔ آج آدمی اپنی برائی کو مصنوعی اعمال میں چھپالیتا ہے۔ کسی کو خوبصورت الفاظ مل گئے ہیں جو اس کی باطل پرستی کو حق پرستی کے روپ میں پیش کررہے ہیں۔ کسی کے لئے اس کی ظاہری رونقیں اس کی باطنی گندگی کا پردہ بن گئی ہے۔ ہر آدمی کی حقیقت "رات" کی تاریکی میں ڈھکی ہوئی ہے۔ مگر قیامت اس طرح کے تمام پردوں کو پھاڑ دے گی، وہ دن کی روشنی کی طرح ہر چیز کو اس کی اصلی حالت میں دکھادے گی۔

وہ وقت بھی کیسا عجیب ہوگا جب حقیقتوں سے پردہ اٹھایا جائے گا۔ اس دن ہر آدمی وہاں کھڑا ہوا دکھائی دے گا جہاں وہ حقیقۃً تھا نہ کہ اس مصنوعی مقام پر جہاں وہ آج اپنے کو کھڑا کئے ہوئے ہے۔

کتنے لوگ جو آج اقتدار کے مالک بنے ہوئے ہیں اس دن ان کے پاس عجز اور بے چارگی کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ کتنے لوگ جو آج انصاف کی کرسیوں پر بیٹھے ہوئے ہیں اس دن وہ مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے ہوئے نظر آئیں گے۔ کتنے لوگ جو آج اہم شخصیت کا درجہ پائے ہوئے ہیں اس دن وہ کیڑے مکوڑوں سے زیادہ حقیر دکھائی دیں گے۔ کتنے لوگ جن کے پاس آج ہر بات کا شاندار جواب ہے اس دن وہ ایسے بے جواب ہو چکے ہوں گے جیسے کہ ان کے پاس الفاظ ہی نہیں۔

جب موت آئے گی

اگر آپ اپنی دونوں آنکھیں بند کرلیں تو ساری دنیا آپ کے لئے تاریک ہوجائے گی۔ سورج کی روشنی اور آسمان کی بلندی سے لے کر درختوں کی سرسبزیاں اور شہروں کی رونقیں تک سب اندھیرے میں چھپ جائیں گی۔ ساری چیزیں موجود ہوتے ہوئے بھی آپ کے لئے غیر موجود بن جائیں گی۔

ایسی ہی کچھ مثال آخرت کی ہے۔ آخرت ایک مکمل حقیقت ہے۔ بلکہ آخرت سب سے بڑی حقیقت ہے۔ مگر وہ ہم کو نظر نہیں آتی۔ کیونکہ وہ ہمارے لئے غیب میں ہے۔ اس کی طرف سے ہماری آنکھیں بند ہیں۔ موت کا دن وہ دن ہے جب کہ غیب کا پردہ ہماری آنکھوں سے ہٹا دیا جاتا ہے۔ موت کے فوراً بعد آدمی آخرت کی دنیا کو اسی طرح دیکھنے لگتا ہے جس طرح آج ایک بند آنکھ والا آنکھ کھولنے کے بعد موجودہ دنیا کو دیکھتا ہے۔

ایک شخص کی آنکھ پر پٹی باندھ کر اس کو زندہ شیر کے سامنے کھڑا کر دیا جائے۔ وہ بالکل بے خبر ہو کہ وہ کہاں کھڑا ہے۔ اسی حالت میں اچانک اس کی آنکھ کھول دی جائے۔ اس وقت زندہ اور کھلے ہوئے شیر کو اپنے سامنے دیکھ کر اس کا جو حال ہوگا اس سے کہیں زیادہ بدحواسی آدمی کے اوپر اس وقت طاری ہوگی جب کہ وہ موت کے بعد اچانک آخرت کو دیکھے گا۔

وہ شخص جو دنیا میں اپنے آپ کو بہت سے سہاروں کے درمیان پاتا تھا، اچانک دیکھے گا کہ وہ بالکل بے سہارا ہو چکا ہے۔ اس کے وہ دوست اس سے چھوٹ چکے ہوں گے جن کے درمیان وہ تفریح کرتا تھا۔ اس کے وہ بیوی بچے اس کے لئے غیر بن چکے ہوں گے جن کو وہ اپنا سمجھ کر اپنا سب کچھ ان کے اوپر قربان کر رہا تھا۔ اس کے وہ مادی اسباب جن پر وہ اعتماد کئے ہوئے تھا، مکڑی کے جالے سے بھی زیادہ بے حقیقت ثابت ہوں گے۔ وہ باتیں جن کو وہ بے وزن سمجھ کر نظر انداز کر دیتا تھا وہ لوہے اور پتھر سے بھی زیادہ سخت بن کر اس کے سامنے کھڑی ہوں گی۔

دوسری دنیا

خدا کی موجودہ دنیا حد درجہ مکمل دنیا ہے مگر اس کا نظام امتحان کے مقصد کے تحت بنایا گیا ہے، خدا کے منصوبہ کے تحت مستقل اور معیاری دنیا وہ ہے جو جزا و سزا کے تقاضوں کو پورا کرے۔ موجودہ دنیا میں ایسا نہیں ہوتا۔ اس لئے امتحان کی مدت پوری ہونے کے بعد خدا موجودہ دنیا کو توڑ دے گا اور دوسری زیادہ کامل دنیا بنائے گا جہاں برے لوگ اور اچھے لوگ ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں اور ہر ایک اپنے عمل کا ٹھیک ٹھیک بدلہ پا سکے۔

موجودہ دنیا میں ایک عجیب و غریب تضاد نظر آتا ہے۔ یہاں چڑیاں خدا کی حمد کے نغمے گاتی ہیں مگر انسان انسان کا قصیدہ پڑھتا ہے۔ یہاں ستارے اور سیارے ایک دوسرے سے ٹکرائے بغیر اپنا سفر کرتے ہیں مگر انسان جان بوجھ کر ایسا راستہ اختیار کرتا ہے جس میں اس کا دوسروں سے ٹکراؤ ہو۔ یہاں کوئی درخت دوسرے درخت کی کاٹ نہیں کرتا۔ مگر اسی دنیا میں ایک انسان دوسرے انسان کی تخریب کے منصوبے بناتا ہے یہاں لمبا کھڑا ہوا درخت اپنا سایہ زمین پر بچھا کر اپنے عجز کا اقرار کرتا ہے مگر انسان کو اگر کوئی بلندی حاصل ہو جائے تو وہ فوراً اکڑنے لگتا ہے۔

انسان کا یہ رویہ خدا کی اس پسند کے سراسر خلاف ہے جو اس نے اپنی پوری کائنات میں نافذ کر رکھا ہے۔ قیامت اسی لئے آئے گی کہ وہ اس تضاد کو ختم کر دے۔ وہ خدا کے سوا ہر بڑائی کی نفی کر دے، وہ خدا کی مرضی کے سوا ہر مرضی کو باطل ثابت کر دے۔

امتحان کی مدت پوری ہونے کے بعد خدا موجودہ دنیا کو توڑ کر ایک اور دنیا بنائے گا۔ وہاں اچھے اور برے ایک دوسرے سے الگ کر دئے جائیں گے۔ اس کے بعد اچھے لوگ جنت میں ہوں گے اور برے لوگ جہنم میں۔

اچھی زندگی

متوکل علی اللہ (۲۴۷ - ۲۰۷ ھ) ایک عباسی خلیفہ تھا۔ فتح بن خاقان کہتے ہیں کہ ایک روز میں خلیفہ متوکل کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس وقت وہ سر نیچا کئے ہوئے کچھ سوچ رہا تھا۔ میں نے کہا: امیرالمومنین، آپ کچھ فکرمند معلوم ہوتے ہیں۔ حالاں کہ آپ وہ شخص ہیں جس کو روئے زمین پر سب سے زیادہ آسائش کے سامان حاصل ہیں۔ خلیفہ متوکل نے میری بات سن کر اپنا سر اٹھایا اور کہا:

اے فتح، مجھ سے زیادہ اچھی زندگی اس شخص کی ہے جس کے پاس ایک کشادہ مکان ہو، نیک بیوی ہو، بقدر ضرورت روزی کا انتظام ہو، نہ ہم اس کو جانتے ہوں کہ اس کو تکلیف دیں اور نہ وہ ہمارا محتاج ہو کہ ہم اس کو رسوا کریں (تاریخ الخلفاء، صفحہ ۲۴۱)

"اچھی زندگی" اس کا نام نہیں کہ آدمی کے پاس زندگی کے ساز و سامان کی کثرت ہو۔ اچھی زندگی کا راز قناعت ہے۔ قناعت کی دولت اسے ملتی ہے جو بقدر ضرورت چیزوں پر راضی ہو جائے اور شہرت و عزت سے بے نیاز ہو کر جینا جانتا ہو۔

کسی کو بقدر ضرورت روزی حاصل ہو تو اس سے بڑی کوئی نعمت نہیں۔ بقدر ضرورت روزی پر مطمئن نہ ہونا صرف حرص کی بنا پر ہوتا ہے اور حریص آدمی کے لئے کبھی اطمینان نہیں۔ کیونکہ بقدر ضرورت کی تو حد ہے مگر حرص کی کوئی حد نہیں۔

بیوی اس لئے ہے کہ وہ زندگی کی رفیق بنے اور آدمی کے لئے گھریلو سکون کا ذریعہ ہو۔ مگر یہ فائدہ صرف نیک اور صالح بیوی سے حاصل ہوتا ہے۔ دوسری تمام خصوصیات جو آدمی ایک عورت میں تلاش کرتا ہے وہ زوال پذیر بھی ہیں اور نئے نئے مسائل پیدا کرنے والی بھی۔

کسی کے پاس کشادہ مکان ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کو خود اپنی ایک دنیا حاصل ہے جہاں وہ اپنی پسند کے مطابق ایک زندگی بنا کر اس کے اندر رہ سکتا ہے۔ دانش مند آدمی کے لئے کشادہ مکان گویا طوفان نوح کے درمیان ایک کشتی نوح ہے۔

گم نامی آدمی کے لئے سب سے بڑی عافیت ہے۔ کیوں کہ جو شخص نام حاصل کرلے اس کو حاسدین کے حسد سے بچنا ممکن نہیں۔ اسی طرح جس شخص کو خدا نے دوسروں کی محتاجی سے بچایا ہو اس سے بڑا خوش قسمت اور کوئی نہیں۔ کیوں کہ لوگوں کا حال یہ ہے کہ وہ عین اس مقام پر آدمی کو ذلیل کر دیتے ہیں جہاں وہ حاجت مند بن کر ان کے سامنے آیا ہو۔

ٹاپ کی جگہ خالی ہے

کچھ مسلم نوجوان بیٹھے ہوئے آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ہر ایک ماحول کی شکایت کر رہا تھا داخلے نہیں ہوتے، ملازمت نہیں ملتی۔ کام نہیں ملتا وغیرہ۔ ایک زیادہ عمر کا تجربہ کار آدمی بھی مجلس میں بیٹھا ہوا تھا۔ وہ خاموشی سے سب کی باتیں سن رہا تھا۔ آخر میں اس نے کہا: آپ لوگوں کی شکایتیں بالکل بے جا ہیں۔ آپ وہاں جگہ ڈھونڈ رہے ہیں جہاں جگہیں بھری ہوئی ہیں۔ اور جہاں جگہ خالی ہے وہاں پہنچنے کی کوشش نہیں کرتے۔ آپ لوگ اونچی لیاقت پیدا کیجئے۔ پھر آپ کے لئے مایوسی کا کوئی سوال نہ ہوگا۔ کیونکہ عام جگہیں اگرچہ بھری ہوئی ہیں۔ مگر ٹاپ کی جگہ ہر طرف خالی ہے۔

امتیاز کامیابی کا راز ہے۔ آپ طالب علم ہوں یا تاجر، آپ وکیل ہوں یا ڈاکٹر، آپ خواہ جس میدان میں بھی ہوں، اپنے اندر امتیاز پیدا کرنے کی کوشش کیجئے اور یقیناً آپ کامیاب رہیں گے۔ اگر آپ چوہا پکڑنے کا اچھا پنجرہ ہی بنانا جانتے ہوں تو لوگ خود آکر آپ کا دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیں گے۔ لوگوں کی غلطی یہ ہے کہ جس قسم کے "پنجرے" بازار میں بھرے ہوئے ہیں اسی قسم کا ایک اور "پنجرہ" بنا کر بازار میں بیٹھ جاتے ہیں اور پھر شکایت کرتے ہیں کہ ہمارا پنجرہ فروخت نہیں ہوتا۔ اگر آپ محنت کریں اور اپنے دماغ کو استعمال کر کے امتیازی پنجرہ بنائیں تو یقیناً لوگ اس کو خریدنے کے لئے ٹوٹ پڑیں گے۔

ہر ماحول میں ہمیشہ تعصب اور تنگ نظری موجود ہوتی ہے۔ یہ بالکل فطری ہے۔ مگر تعصب اور تنگ نظری کے عمل کی ایک حد ہے۔ اگر آپ اس حد کو پار کر جائیں تو تعصب اور تنگ نظری ہو کر بھی آپ کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ آپ کے نمبر ۴۰ فی صد ہیں اور آپ کے حریف کے ۴۰ فی صد، تو عین ممکن ہے کہ تعصب آپ کی راہ میں حائل ہو جائے اور آپ کو نہ لیا جائے۔ لیکن اگر ایسا ہو کہ حریف کے نمبر ۴۰ فی صد ہیں اور آپ کے نمبر ۸۰ فی صد تو تعصب اور تنگ نظری کی تمام دیواریں گر جائیں گی اور یقینی طور پر آپ اپنے حریف کے مقابلہ میں کامیاب رہیں گے۔

معمولی جگہیں بھری ہوئی ہیں مگر ٹاپ کی جگہ خالی ہے۔ پھر آپ کیوں نہ اس خالی جگہ پر پہنچنے کی کوشش کریں جو اب بھی آپ کا انتظار کر رہی ہے۔ اگر آپ دوسروں سے زیادہ محنت کریں۔ اگر آپ عام معیار سے اونچا معیار پیش کریں۔ اگر آپ زیادہ بڑھی ہوئی صلاحیت کے ساتھ زندگی کے میدان میں داخل ہوں تو آپ کے لئے بے جگہ یا بے روزگار ہونے کا کوئی سوال نہیں ہر جگہ آپ کی جگہ ہے، کیونکہ وہ اب تک کسی آنے والے کے انتظار میں خالی پڑی ہوئی ہے۔

صراط مستقیم

انسان کے لئے کامیابی کی منزل تک پہنچنے کا سیدھا راستہ صرف ایک ہے اور وہ خدا کی طرف رخ کرنا ہے۔ یعنی اپنی تمام توجہات اور سرگرمیوں کو خدا کی طرف موڑ دینا۔ خدا کو اپنا سب کچھ بنا کر اس کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنا، یہی صراط مستقیم ہے۔ اس کے برعکس ہر وہ راستہ منزل سے بھٹکا ہوا راستہ ہے جس میں خدا کی طرف رخ نہ پایا جاتا ہو۔

اپنے نفس کی مانگیں پوری کرنے میں لگا رہنا۔ کسی زندہ یا مردہ شخص کی بڑائی میں گم رہنا، مثبت مقصد کے بجائے منفی چیزوں کی طرف دوڑنا۔ حسد اور بغض اور انتقام اور انانیت کے جذبات کے تحت عمل کرنا۔ قوم یا وطن یا جماعت کو سب سے اونچا مقام دے کر اس کے لئے اپنے کو وقف کر دینا۔ یہ سب ٹیڑھی راہیں ہیں جو اصل راستہ کے دائیں بائیں سے نکلتی ہیں۔ وہ اصل منزل کے اِدھر اُدھر سے گزر جاتی ہیں اور اپنے مسافر کو منزل تک نہیں پہنچاتیں۔

جب بھی ایسا ہو کہ آدمی کے دل میں خدا کے سوا کسی اور کی یاد سما جائے، وہ خدا کے سوا کسی اور کو پکارے اور خدا کے سوا کسی اور کو اپنے جذبات کا مرکز بنالے، اس کی سرگرمیوں کا رخ خدا کے سوا کسی اور چیز کی طرف ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ صراط مستقیم سے بھٹک گیا، اس نے اپنے "نقطہ" سے خدا کے "نقطہ" کی طرف سفر نہیں کیا۔

ریل گاڑی کی ایک پٹری ہوتی ہے۔ گاڑی اگر پٹری پر چلے تو وہ کامیابی کے ساتھ اپنی منزل تک پہنچ جاتی ہے۔ اور اگر اس کے پہیے پٹری کے دائیں بائیں اتر جائیں تو اس کا راستہ کھوٹا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی منزل پر پہنچنے میں کامیاب نہیں ہوتی۔ ایسا ہی معاملہ انسان کا ہے۔ انسان اگر سیدھا اپنے خدا کی طرف سفر کرے تو اس کا سفر صحیح طور پر جاری رہتا ہے اور بالآخر اس کو منزل تک پہنچا دیتا ہے۔ اگر اس کے سفر کا رخ خدا کی طرف نہ رہے تو وہ بھٹک جاتا ہے اور بربادی کے سوا کسی انجام تک نہیں پہنچتا۔

تعمیر کی فتح

صبح کو وہ سو کر اٹھا تو کمرہ میں چڑیا کا انڈا ٹوٹا ہوا پڑا تھا۔ یہ گوریا کا انڈا تھا جس نے چھت کی لکڑی میں ایک گوشہ پاکر وہاں اپنا گھونسلا بنا رکھا تھا۔ اس گھونسلے کی وجہ سے کمرہ میں ہر وقت چڑیوں کا شور رہتا۔ تنکے گرتے رہتے۔ آدمی نے فرش پر ٹوٹا ہوا انڈا دیکھا تو اس نے گھونسلا اجاڑ کر پھینک دیا۔

اگلے دن پھر وہی "چوں چوں" کا شور تھا۔ چڑیاں دوبارہ چھت کی لکڑی میں تنکے جمع کر رہی تھیں۔ شاید اجڑے ہوئے گھونسلے کو دوبارہ بنا بنایا دیکھنے کے جذبہ نے ان کے اندر عمل کا شوق بڑھا دیا تھا۔ دوسرا گھونسلا انھوں نے اس سے کم مدت میں بنا لیا جتنی مدت میں انھوں نے پہلا گھونسلا بنایا تھا۔ چڑیوں کی اس جسارت پر اس کو غصہ آیا اور اس نے دوبارہ ان کا گھونسلا اجاڑ کر پھینک دیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اس نے چڑیوں کے اوپر آخری طور پر فتح پالی ہے۔ مگر اگلے دن پھر گھونسلے کا مسئلہ اس کے سر پر موجود تھا۔ چڑیوں نے جب دیکھا کہ ان کا بنا بنایا گھونسلا اجاڑ دیا گیا ہے اور انڈے توڑے جا چکے ہیں تو انھوں نے رونے میں یا فریاد کرنے میں وقت ضائع نہیں کیا۔ انھوں نے ایسا بھی نہیں کیا کہ باہر جاکر دوسری ہم جنس چڑیوں کو ڈھونڈیں اور ان کے ساتھ متحدہ محاذ بنا کر گھر پر حملہ کریں۔ اس کے برعکس وہ خاموشی سے باہر نکل گئیں اور ایک ایک تنکا لاکر دوبارہ گھونسلا بنانا شروع کر دیا۔

اب یہی روزانہ کا قصہ ہو گیا۔ چڑیاں روزانہ گھونسلا بنانا شروع کرتیں اور آدمی روزانہ اس کو اجاڑ دیتا۔ اسی طرح ایک مہینہ گزر گیا۔ اس دوران میں کتنی ہی بار چڑیوں کی محنت ضائع ہوئی۔ ان کے چنے ہوئے تنکے بیکار ہو گئے۔ مگر چڑیاں ان چیزوں سے بے پروا ہو کر اپنا کام کئے جا رہی تھیں۔ آدمی کی نفرت کا جواب چڑیوں کے پاس صرف خاموش عمل تھا۔ آدمی کی تخریب کا مقابلہ ہر بار وہ نئی تعمیر سے کرتی تھیں۔ چڑیوں کا دشمن طاقت ور تھا مگر طاقت ور دشمن کا توڑ انھوں نے اپنے لگاتار عمل میں ڈھونڈھ لیا تھا۔

آخر نفرت پر خاموش عمل غالب آیا۔ چڑیوں کی مسلسل تعمیر نے آدمی کی مسلسل تخریب پر فتح پائی۔ ایک مہینہ کے ناکام مقابلہ کے بعد آدمی تھک چکا تھا۔ اس نے چڑیوں کا گھونسلا اجاڑنا چھوڑ دیا۔ اب گوریا نے اپنے گھونسلے کو مکمل کر کے پھر اس میں انڈے دے دئے ہیں۔ وہ ان کو سینے میں مشغول ہے تاکہ وہ اپنی اگلی نسل پیدا کرے اور پھر اپنا کام کر کے اڑ جائے۔ جب یہ چڑیاں اپنے گھونسلے میں جمع ہوتی ہیں تو ان کا "چوں چوں" کا شور اب بھی کمرہ میں گونجتا ہے۔ مگر اب آدمی کو یہ شور برا نہیں لگتا۔ کیونکہ "چوں چوں" کی آواز میں اس کو یہ قیمتی پیغام سنائی دیتا ہے ——— اپنے دشمن سے نفرت نہ کرو۔ ہر حال میں اپنی تعمیری جد وجہد میں لگے رہو۔ تم کامیاب ہو گے۔

اللہ کی عبادت

عبادت اپنے ظاہر کے اعتبار سے کچھ خاص آداب بجالانے کا نام ہے اور حقیقت کے اعتبار سے یہ ہے کہ کسی چیز کو اپنے جذباتِ شوق اور جذباتِ احتیاج کا مرکز بنا لیا جائے۔ اس اعتبار سے ہر آدمی کسی نہ کسی کی عبادت کر رہا ہے۔ ہر آدمی کی کوئی سب سے بڑی چاہت ہوتی ہے جس کو پانے کے لئے وہ اپنا سب کچھ لگا دیتا ہے۔ ہر آدمی کہیں اپنے کو محتاج محسوس کرتا ہے اور اس محتاجی کی تلافی کے لئے وہ کسی نہ کسی کی مدد پر بھروسہ کئے ہوئے ہوتا ہے۔ جب آدمی صرف اللہ کی طرف لپکے اور صرف اللہ پر بھروسہ کرے تو یہی اللہ کی عبادت کرنا ہے اور جو شخص اللہ کے سوا کسی اور کو اپنے ان جذبات کا مرکز بنالے تو وہ اللہ کے سوا دوسروں کی عبادت کر رہا ہے۔

جو شخص اللہ کی عبادت کرے وہ صرف اللہ کو پکارنے لگتا ہے۔ اسی پکار کے ایک روزمرہ طریقہ کا نام نماز ہے۔ وہ اپنے رب میں اتنا مشغول ہوتا ہے کہ اس کی اپنی ضرورتیں بھی اس سے کم ہو جاتی ہیں، اسی کی ایک متعین صورت کا نام روزہ ہے۔ اس کا شوق اس کو اکساتا ہے کہ وہ اللہ کی طرف دوڑے، اسی کے ایک تاریخی عمل کا نام حج ہے۔ اس کا سابقہ جب انسانوں سے پڑتا ہے تو لوگوں کے ساتھ بھی وہ اسی عنایت کا سلوک کرنے لگتا ہے جس عنایت کو وہ اپنے لئے اپنے رب سے مانگ رہا ہے، اسی کے ایک مقررہ نظام کا نام زکوٰۃ ہے۔

جو شخص اللہ کا عابد ہو، اس کی پوری زندگی اندر سے باہر تک عبادت بن جاتی ہے۔ وہ اللہ کا ہو جاتا ہے اور اللہ اس کا۔ وہ جھکتا ہے تو اللہ کے لئے جھکتا ہے۔ اس کو اندیشہ ہوتا ہے تو صرف اللہ کا اندیشہ ہوتا ہے۔ اس کے دل میں محبت کے جذبات امنڈتے ہیں تو صرف اللہ کے لئے امنڈتے ہیں۔ وہ زندگی کے معاملات میں لحاظ کرتا ہے تو صرف اللہ کا لحاظ کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو اللہ کے حوالے کر دیتا ہے۔

موقع صرف ایک بار

کالج کے ایک پرانے استاد کے ایک جملہ نے مجھے بہت متاثر کیا ـــــ "زندگی صرف ایک بار ملتی ہے" انھوں نے کہا۔ وہ اپنی زندگی پر تبصرہ کر رہے تھے "میں بی ایس سی کر کے ملازمت میں لگ گیا تھا۔ ایم ایس سی نہیں کیا۔ اب کتنے اچھے اچھے چانس میرے سامنے آتے ہیں۔ مگر میں ان سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا۔ صرف اس لئے کہ میرے پاس ماسٹر ڈگری نہیں۔ اگر آپ کے پاس اعلیٰ طاقت نہیں ہے تو آپ اعلیٰ مواقع سے فائدہ اٹھانے سے بھی محروم رہیں گے"۔

یہ تبصرہ ہمارے سماج کے تقریباً ۹۹ فی صد لوگوں پر صادق آتا ہے۔ ابتدائی عمر انسان کے لئے تیاری کی عمر ہے۔ مگر بیشتر افراد اس عمر کو پوری طرح استعمال میں نہیں لاتے۔ وہ اپنے بہترین وقت کو سستے مشاغل میں ضائع کر دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں اور کام کرنے کا وقت آجاتا ہے۔ اب وہ مجبور ہوتے ہیں کہ کمتر تیاری کے ساتھ عملی زندگی کے میدان میں داخل ہو جائیں۔ وہ چاہنے کے باوجود زیادہ ترقی نہیں کر پاتے۔ ان کو ساری عمر اس طرح گزارنی ہوتی ہے کہ اس دنیا میں ان کی صلاحیتوں کے لئے جو آخری امکان مقدر تھا، اس سے بہت کم امکان تک وہ پہنچ پاتے ہیں۔ وہ محرومی اور ناکامی کے احساس کے تحت زندگی گزارتے رہتے ہیں، یہاں تک کہ اسی حال میں مرجاتے ہیں۔

اگر آپ کمتر تیاری کے ساتھ زندگی کے میدان میں داخل ہوئے ہیں تو اس دنیا میں آپ اپنا بھرپور حصہ نہیں پا سکتے، اور جو ایک بار محروم رہا وہ گویا ہمیشہ کے لئے محروم رہا۔ کیونکہ ـــــ زندگی صرف ایک بار ملتی ہے، بار بار نہیں ملتی۔

پتھر ہر ایک کے لئے سخت ہے۔ مگر پتھر اس شخص کے لئے نرم ہو جاتا ہے جس نے اس کو توڑنے کا اوزار فراہم کر لیا ہو۔ یہی صورت ہر معاملہ میں پیش آتی ہے۔ اگر آپ لیاقت اور اہلیت کے ساتھ زندگی کے میدان میں داخل ہوں تو ہر جگہ آپ اپنا حق وصول کر کے رہیں گے۔ اور اگر لیاقت اور اہلیت کے بغیر آپ نے زندگی کے میدان میں قدم رکھا ہے تو آپ کے لئے اس دنیا میں اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ اپنی مفروضہ حق تلفی کے خلاف فریاد و احتجاج کرتے رہیں۔

ماحول سے امید نہ رکھئے بلکہ اپنی محنت اور لیاقت پر بھروسہ کیجئے، آپ کو کبھی ماحول سے شکایت نہ ہوگی۔ ماحول کی شکایت دراصل ماحول سے زیادہ خود اپنی نالائقی کا اظہار ہے۔ کیونکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے وہ مطلوبہ تیاری نہیں کی تھی جو ماحول سے اپنا حق وصول کرنے کے لئے ضروری ہے۔

پتھر کا سبق

راجستھان کا ایک طالب علم ہائی اسکول میں فیل ہوگیا۔ دوسرے سال اس نے پھر امتحان دیا۔ مگر وہ دوبارہ فیل ہوگیا۔ اس کے بعد جب اس کا تیسرے سال کا نتیجہ آیا اور اس نے دیکھا کہ وہ اب بھی فیل ہے تو اس کو سخت دھکا لگا۔ وہ اتنا بیزار ہوا کہ گھر سے بھاگ نکلا۔

چلتے چلتے وہ ایک گاؤں کے کنارے پہنچا۔ اس کو پیاس لگ رہی تھی۔ اس نے دیکھا کہ ایک کنواں ہے جس پر کچھ عورتیں اور بچے پانی بھر رہے ہیں۔ وہ کنویں کے پاس پہنچا تاکہ اپنی پیاس بجھا سکے۔ مگر وہاں اس نے ایک منظر دیکھا۔ منظر بظاہر چھوٹا سا تھا مگر وہ اس سے اتنا متاثر ہوا کہ اپنی پیاس بھول گیا۔ اس کو اچانک محسوس ہوا کہ اس نے پانی سے زیادہ بڑی ایک چیز پالی ہے۔

اس نے دیکھا کہ گاؤں کے لوگ جو پانی بھرنے کے لئے کنویں پر آتے ہیں، عام طور پر ان کے ساتھ دو عدد مٹی کے گھڑے ہوتے ہیں۔ ایک گھڑے کو وہ کنویں کے قریب ایک پتھر پر رکھ دیتے ہیں اور دوسرے گھڑے کو کنویں میں ڈال کر پانی نکالتے ہیں۔ اس نے دیکھا کہ جس پتھر پر گھڑا رکھا جاتا ہے وہ گھڑا رکھتے رکھتے گھس گیا ہے۔

"گھڑا مٹی کی چیز ہے" اس نے سوچا "مگر جب وہ بار بار بہت دنوں تک ایک جگہ رکھا گیا تو اس کی رگڑ سے پتھر گھس گیا۔ استقلال کے ذریعہ مٹی نے پتھر کے اوپر فتح حاصل کرلی۔ مسلسل عمل نے کمزور کو طاقت ور کے اوپر غالب کردیا۔ پھر اگر میں برابر محنت کروں تو کیا میں امتحان میں کامیاب نہیں ہوسکتا۔ کیا کوشش کے اضافہ سے میں اپنی کمی پر قابو نہیں پاسکتا۔"

یہ سوچ کر بھاگے ہوئے طالب علم کے قدم رک گئے۔ وہ لوٹ کر اپنے گھر واپس آگیا اور دوبارہ تعلیم میں اپنی محنت شروع کردی۔ اگلے سال وہ چوتھی بار ہائی اسکول کے امتحان میں بیٹھا۔ اس بار نتیجہ حیرت انگیز طور پر مختلف تھا۔ اس کے پرچے اتنے اچھے ہوئے کہ وہ اول درجہ میں پاس ہوگیا۔ تین بار ناکام ہونے والے نے چوتھی کوشش میں نمایاں کامیابی حاصل کی۔ پتھر کا یہ سبق نوجوان کی زندگی کے لئے اتنا اہم ثابت ہوا کہ اس کی زندگی کا رخ بدل گیا۔ جو طالب علم ہائی اسکول میں مسلسل ناکام ہوکر بھاگا تھا وہ اس کے بعد مسلسل فرسٹ آنے لگا۔ یہاں تک کہ ایم اے میں اس نے ٹاپ کیا۔ اس کے بعد وہ ایک اسکالرشپ پر اعلیٰ تعلیم کے لئے بیرونی ملک میں گیا۔ اور وہاں سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ آج وہ ایک ہندستانی یونیورسٹی میں اعلیٰ تعلیمی عہدے پر فائز ہے۔

یہ کوئی انوکھا واقعہ نہیں جو صرف ایک گاؤں میں پیش آیا ہو۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر جگہ ایسے "پتھر" موجود ہیں جو آدمی کو زندگی کا سبق دے رہے ہیں جو ناکامیوں میں سے کامیاب بن کر نکلنے کا اشارہ دیتے ہیں۔ اگر آدمی کے اندر نصیحت لینے کا مزاج ہو تو وہ اپنے قریب ہی ایسا ایک "پتھر" پالے گا جو خاموش زبان میں اس کو وہی پیغام دے رہا ہو جو مذکورہ نوجوان کو اپنے پتھر سے ملا تھا۔

اعتراف

بھوپال کے قریب ایک گاؤں کا واقعہ ہے۔ لوگ عام طور پر جاہل اور نماز وغیرہ سے بے تعلق تھے۔ ایک عالم اس گاؤں میں جانے لگے۔ انھوں نے لوگوں کو غیرت دلائی اور ان کو جوڑ کر نماز پر آمادہ کیا اور وہاں جمعہ بھی قائم کیا۔ اب وہاں پنج وقتہ نماز اور جمعہ ہونے لگا۔

اس کے بعد ایسا ہوا کہ شاہ محمد یعقوب مجددی (۱۳۳۹ - ۱۲۰۳ھ) کا اس گاؤں میں جانا ہوا۔ اگلے دن جمعہ تھا۔ لوگوں نے کہا کہ آپ کل تک یہاں ٹھہریں اور کل آپ ہی یہاں جمعہ پڑھائیں۔ حضرت شاہ صاحب کی نظر مسئلہ پر گئی۔ انھوں نے کہا کہ ایسے چھوٹے گاؤں میں مسئلہ کی رو سے جمعہ کی نماز جائز نہیں۔ یہ کہہ کر وہ شہر واپس آ گئے تاکہ یہاں جمعہ کی نماز ادا کر سکیں۔

اس کے بعد مذکورہ عالم کا اس گاؤں میں جانا ہوا۔ انھوں نے دیکھا کہ وہاں نماز کا نظام ٹوٹ گیا ہے۔ لوگوں نے اپنے گاؤں میں نماز جمعہ کی ادائگی چھوڑ دی اور کسی بڑے مقام پر بھی جمعہ پڑھنے کے لئے نہیں گئے۔ لوگوں نے شکایت کی کہ آپ نے یہاں جمعہ قائم کر دیا اور حضرت پیر صاحب آئے تھے تو انھوں نے بتایا کہ اس گاؤں میں جمعہ کی نماز جائز ہی نہیں۔ چنانچہ ہم نے جمعہ پڑھنا چھوڑ دیا۔

مذکورہ عالم یہ صورت حال دیکھ کر بہت پریشان ہوئے اور فوراً روانہ ہو کر حضرت شاہ صاحب کے پاس پہنچے۔ انھوں نے حضرت شاہ صاحب سے پوچھا کہ کیا آپ نے گاؤں والوں سے یہ کہا ہے کہ یہاں جمعہ کی نماز جائز نہیں۔ حضرت شاہ صاحب نے کہا ہاں میں نے کہا ہے۔ اور مسئلہ تو یہی ہے۔ مذکورہ عالم نے کہا کہ حضرت آپ درست فرماتے ہیں۔ مگر صورت حال یہ ہے کہ اس گاؤں کے لوگ نماز چھوڑے ہوئے تھے۔ ان کو کہہ سن کر نماز کی طرف متوجہ کیا ہے۔ شرائط جمعہ کے مسائل اپنی جگہ صحیح ہیں۔ مگر ابھی ان لوگوں میں اتنی رغبت نہیں کہ وہ جمعہ کی خاطر سفر کر کے باہر جائیں اور مرکزی مقام پر جمعہ کی نماز ادا کریں۔ ان کے مزاج کی رعایت کرتے ہوئے میں نے وہاں جمعہ کی نماز شروع کرا دی تھی تاکہ کسی طرح وہ عادی ہو جائیں۔

حضرت شاہ محمد یعقوب مجددی نے یہ سنا تو فرمایا کہ آپ بالکل صحیح کہتے ہیں۔ مجھ سے غلطی ہو گئی۔ اس کے بعد اگلے جمعہ کو وہ دوبارہ اگاؤں میں گئے اور لوگوں سے کہا کہ مذکورہ عالم کا جمعہ قائم کرنا بالکل صحیح تھا۔ "اصل یہ ہے کہ میں نے متن دیکھا تھا، حاشیہ نہیں دیکھا۔ حاشیہ میں وہ مسئلہ موجود ہے جو مولوی صاحب نے تم لوگوں کو بتایا۔ اب تم لوگ پہلے کی طرح یہاں نماز جمعہ ادا کرو" اس کے بعد خود وہاں کے لوگوں کے ساتھ نماز جمعہ ادا کی۔ اور پھر شہر واپس آئے۔

مجھے آخرت تک جانا ہے

مولانا اشرف علی تھانوی ایک بار ٹرین سے سفر کر رہے تھے۔ ان کو اعظم گڑھ جانا تھا۔ ایک ریلوے گارڈ جو ان کا معتقد تھا اسٹیشن پر ان سے ملنے کے لئے آیا۔ اتنے میں ایک دیہاتی آدمی بھی آگیا۔ اس نے گنے کا ایک گٹھا تحفہ کے طور پر مولانا کو پیش کیا۔ مولانا نے قبول کر لیا اور اپنے ساتھی سے کہا کہ ان گنوں کا وزن کرا کے ان کو بک کروالو۔ گارڈ نے کہا: بک کروانے کی کیا ضرورت ہے۔ اس ٹرین سے جو گارڈ جا رہا ہے میں اس سے کہہ دیتا ہوں۔ وہ خیال رکھے گا۔ مولانا نے کہا کہ تمہارا گارڈ تو اسی ٹرین تک ساتھ رہے گا اور مجھے آگے جانا ہے۔ گارڈ نے سمجھا کہ مولانا کو آگے کسی اسٹیشن پر یہ ٹرین بدل کر دوسری ٹرین پکڑنا ہے۔ اس نے کہا: کوئی ہرج نہیں۔ میں گارڈ کو بتا دیتا ہوں وہ آگے والے گارڈ سے بھی کہہ دے گا اور آپ کو کوئی زحمت نہ ہوگی۔ مولانا نے کہا: مجھے اس سے بھی آگے جانا ہے۔ گارڈ نے حیرت سے پوچھا: آخر آپ کہاں تک جائیں گے۔ ابھی تو آپ نے فرمایا تھا کہ آپ اعظم گڑھ جا رہے ہیں۔ مولانا نے کسی قدر خاموشی کے بعد کہا: مجھے آخرت تک جانا ہے، وہاں تک کون سا گارڈ میرے ساتھ جائے گا"

یہ معاملہ محض ریل کے سفر کا نہیں بلکہ تمام معاملات کا ہے۔ آدمی کا ہر معاملہ آخرت کا معاملہ ہے۔ دنیا میں کوئی "گارڈ"، وقتی طور پر آپ کا ساتھ دے سکتا ہے۔ مگر آخرت کی منزل پر پہنچ کر کوئی گارڈ ساتھ دینے والا نہیں۔ جس کا ذہن یہ ہو کہ مجھے آخرت تک جانا ہے وہ ہر اس چیز کو بے قیمت سمجھے گا جو آخرت میں بے قیمت ہو جانے والی ہو، خواہ آج وہ کتنی ہی قیمتی نظر آئے۔ اسی طرح وہ ہر اس چیز کو وزن دینے پر مجبور ہوتا ہے جو آخرت میں باوزن ثابت ہونے والی ہو، خواہ آج کی دنیا میں بظاہر وہ کتنی ہی بے وزن دکھائی دے۔

آدمی حق کا انکار کرنے کے لئے آج خوبصورت الفاظ پا لیتا ہے۔ مگر آخرت میں اس کو معلوم ہوگا کہ وہ اس کا ساتھ چھوڑ کر پیچھے رہ گئے۔ آدمی طاقت کے بل پر بے انصافی کرتا ہے اور خوش ہوتا ہے کہ مظلوم اس کا کچھ بگاڑ نہیں سکتا۔ مگر آخرت میں وہ دیکھے گا کہ اس کی طاقت پیچھے کی دنیا میں رہ گئی ہے، آخرت میں وہ اس کا ساتھ دینے کے لئے موجود نہیں ہے۔ آدمی کے ساز و سامان اس کو دھوکا دیتے ہیں اور وہ اپنے گھمنڈ کا مینار کھڑا کرتا ہے۔ مگر آخرت میں وہ پائے گا کہ اس کے وہ ساز و سامان اس سے بہت دور ہو چکے ہیں جن کے اوپر وہ گھمنڈ کیا کرتا تھا۔

مومن اور غیر مومن کا فرق ایک لفظ میں یہ ہے کہ غیر مومن یہ سمجھ کر زندگی گزارتا ہے کہ اس کو اسی دنیا میں رہنا ہے۔ اور مومن اس نفسیات کے ساتھ جیتا ہے کہ اس کو آخرت تک جانا ہے۔ نفسیات کا یہ فرق دونوں کی زندگیوں میں اتنا زیادہ عملی فرق پیدا کر دیتا ہے کہ ایک جہنم کا مستحق ہو جاتا ہے اور دوسرا جنت کا۔

اور یتیم کے مال کے پاس نہ جاؤ مگر ایسے طریقے سے جو بہتر ہو یہاں تک کہ وہ اپنی جوانی کو پہنچ جائے۔ اور ناپ تول میں پورا انصاف کرو۔ ہم کسی کے ذمہ وہی چیز لازم کرتے ہیں جس کی اسے طاقت ہو۔ اور جب بولو تو انصاف کی بات بولو خواہ معاملہ اپنے رشتہ دار ہی کا ہو۔ اور اللہ کے عہد کو پورا کرو۔ یہ چیزیں ہیں جن کا اللہ نے تمھیں حکم دیا ہے تاکہ تم نصیحت پکڑو۔ اور اللہ نے حکم دیا کہ یہی میری سیدھی شاہراہ ہے۔ پس اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ تم کو اللہ کے راستہ سے جدا کر دیں گی۔ یہ اللہ نے تم کو حکم دیا ہے تاکہ تم بچتے رہو ۱۵۲-۵۴

یتیم کسی سماج کا سب سے کمزور فرد ہوتا ہے۔ وہ تمام اضافی اسباب اس کی ذات میں حذف ہو جاتے ہیں جو عام طور پر کسی کے ساتھ اچھے سلوک کا محرک بنتے ہیں۔ "یتیم" کے ساتھ ذمہ داری کا معاملہ وہی شخص کر سکتا ہے جو خالص اصولی بنیاد پر باکردار بنا ہو نہ کہ فائدہ اور مصلحت کی بنیاد پر۔ یتیم کسی سماج میں حسن سلوک کی آخری علامت ہوتا ہے۔ جو شخص یتیم کے ساتھ خیر خواہانہ سلوک کرے وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ بدرجہ اولیٰ خیر خواہانہ سلوک کرے گا۔

کائنات کی ہر چیز دوسری چیز سے اس طرح وابستہ ہے کہ ہر چیز دوسرے کو وہی دیتی ہے جو اس کو دینا چاہئے اور دوسرے سے وہی چیز لیتی ہے جو اس کو لینا چاہئے۔ یہی اصول انسان کو اپنی زندگی میں اختیار کرنا ہے۔ انسان کو چاہئے کہ جب وہ دوسرے انسان کے لئے ناپے تو ٹھیک ناپے اور جب تولے تو ٹھیک تولے۔ ایسا نہ کرے کہ اپنے لئے ایک پیمانہ استعمال کرے اور غیر کے لئے دوسرا پیمانہ۔

زندگی میں بار بار ایسے مواقع آتے ہیں کہ آدمی کو کسی کے خلاف اظہار رائے کرنا ہوتا ہے۔ ایسے مواقع پر خدا کا پسندیدہ طریقہ یہ ہے کہ آدمی وہی بات کہے جو انصاف کے معیار پر پوری اترنے والی ہو۔ کوئی اپنا ہو یا غیر ہو۔ اس سے دوستی کے تعلقات ہوں یا دشمنی کے تعلقات، ایسا شخص ہو جس سے کوئی فائدہ وابستہ ہے یا ایسا شخص ہو جس سے کوئی فائدہ وابستہ نہیں، ان تمام چیزوں کی پروا کئے بغیر آدمی وہی کہے جو فی الواقع درست اور حق ہے۔

ہر آدمی فطرت کے عہد میں بندھا ہوا ہے۔ کوئی عہد لکھا ہوا ہوتا ہے اور کوئی عہد وہ ہوتا ہے جو لفظوں میں لکھا ہوا نہیں ہوتا مگر آدمی کا ایمان، اس کی انسانیت اور اس کی شرافت کا تقاضا ہوتا ہے کہ اس موقع پر ایسا کیا جائے۔ دونوں قسم کے عہدوں کو پورا کرنا ہر مومن و مسلم کا فریضہ ہے ——— یہ تمام باتیں انتہائی واضح ہیں۔ آسمانی وحی اور آدمی کی عقل ان کے برحق ہونے کی گواہی دیتے ہیں۔ مگر ان سے وہی شخص نصیحت پکڑے گا جو خود بھی نصیحت پکڑنا چاہتا ہو۔

یہ احکام (۵۳ - ۱۵۱) شریعت الٰہی کے بنیادی احکام ہیں۔ ان پر ان کے سیدھے مفہوم کے اعتبار سے عمل کرنا خدا کی سیدھی شاہراہ پر چلنا ہے۔ اور اگر تاویل اور موشگافیوں کے ذریعہ ان میں شاخیں نکالی جائیں اور سارا زور ان شاخوں پر دیا جانے لگے تو یہ ادھر اُدھر کے متفرق راستوں میں بھٹکنا ہے جو کبھی آدمی کو خدا تک نہیں پہنچاتا۔

پھر ہم نے موسیٰ کو کتاب دی نیک کام کرنے والوں پر اپنی نعمت پوری کرنے کے لئے اور ہر بات کی تفصیل اور ہدایت اور رحمت تاکہ وہ اپنے رب کے ملنے کا یقین کریں۔ اور اسی طرح ہم نے یہ کتاب اتاری ہے، ایک برکت والی کتاب ۔ پس اس پر چلو اور اللہ سے ڈرو تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔ اس لئے کہ تم یہ نہ کہنے لگو کہ کتاب تو ہم سے پہلے کے دو گروہوں کو دی گئی تھی اور ہم ان کو پڑھنے پڑھانے سے بے خبر تھے۔ یا کہو کہ اگر ہم پر کتاب اتاری جاتی تو ہم ان سے بہتر راہ پر چلنے والے ہوتے۔ پس آچکی تمھارے پاس تمھارے رب کی طرف سے ایک روشن دلیل اور ہدایت اور رحمت۔ تو اس سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو اللہ کی نشانیوں کو جھٹلائے اور ان سے منھ موڑے۔ جو لوگ ہماری نشانیوں سے اعراض کرتے ہیں ہم ان کو ان کے اعراض کی پاداش میں بہت برا عذاب دیں گے۔ یہ لوگ کیا اس کے منتظر ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یا تمھارا رب آئے یا تمھارے رب کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی ظاہر ہو۔ جس دن تمھارے رب کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی آپہنچے گی تو کسی شخص کو اس کا ایمان نفع نہ دے گا جو پہلے ایمان نہ لا چکا ہو یا اپنے ایمان میں کچھ نیکی نہ کی ہو۔ کہو تم راہ دیکھو، ہم بھی راہ دیکھ رہے ہیں ۱۵۵ - ۵۸

خدا کی طرف سے جو کتاب آتی ہے اس میں اگرچہ بہت سی تفصیلات ہوتی ہیں مگر بالآخر اس کا مقصد صرف ایک ہوتا ہے یہ کہ آدمی اپنے رب کی ملاقات پر یقین کرے۔ یعنی دنیا میں وہ اس طرح زندگی گزارے کہ وہ اپنے ہر عمل کے لئے اپنے آپ کو خدا کے یہاں جواب دہ سمجھتا ہو۔ اس کی زندگی ایک ذمہ دارانہ زندگی ہو نہ کہ آزاد اور بے قید زندگی۔ یہی پچھلی کتابوں کا مقصد تھا اور یہی قرآن کا مدعا بھی ہے۔

خدا نے بقیہ دنیا کو براہ راست اپنے جبری حکم کے تحت اپنا پابند بنا رکھا ہے۔ مگر انسان کو اس نے پورا اختیار دے دیا ہے۔ اس نے انسان کی ہدایت کا یہ طریقہ رکھا ہے کہ رسول اور کتاب کے ذریعہ دلائل کی زبان میں وہ لوگوں کو حق اور باطل سے باخبر کرتا ہے۔ دنیا میں خدا کی مرضی لوگوں کے سامنے دلیل کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہاں دلیل کو ماننا خدا کو ماننا ہے اور دلیل کو جھٹلانا خدا کو جھٹلانا۔

قیامت کا دھماکہ ہونے کے بعد تمام چھپی ہوئی حقیقتیں لوگوں کے سامنے آجائیں گی۔ اس وقت ہر آدمی خدا اور اس کی باتوں کو ماننے پر مجبور ہوگا۔ مگر اس وقت کے ماننے کی کوئی قیمت نہیں۔ ماننا وہی ماننا ہے جو حالتِ غیب میں ماننا ہو۔ ایمان دراصل یہ ہے کہ دیکھنے کے بعد آدمی جو کچھ ماننے پر مجبور ہوگا اس کو وہ دیکھے بغیر مان لے۔ جو شخص دیکھ کر مانے اس نے گویا مانا ہی نہیں۔

جو لوگ آج اختیار کی حالت میں اپنے کو خدا کا پابند بنالیں ان کے لئے خدا کے یہاں جنت ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ قیامت کے آنے کے بعد خدا کے آگے جھکیں گے ان کا جھکنا صرف ان کے جرم کو مزید ثابت کرنے کے ہم معنی ہوگا۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ انھوں نے، خود اپنے اعتراف کے مطابق، ایک ماننے والی بات کو نہ مانا، انھوں نے ایک کئے جانے والے کام کو نہ کیا۔

جنھوں نے اپنے دین میں راہیں نکالیں اور گروہ گروہ بن گئے تم کو ان سے کچھ سروکار نہیں۔ ان کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ پھر وہی ان کو بتادے گا جو وہ کرتے تھے۔ جو شخص نیکی لے کر آئے گا تو اس کے لئے اس کا دس گنا ہے۔ اور جو شخص برائی لے کر آئے گا تو اس کو بس اس کے برابر بدلہ ملے گا اور ان پر ظلم نہیں کیا جائے گا ۱۶۰-۱۵۹

دین یہ ہے کہ آدمی ایک خدا کے سوا کسی کو اپنی زندگی میں برتر مقام نہ دے۔ وہ حق شناسی کی بنیاد پر تعلقات قائم کرے نہ کہ مفاد کی بنیاد پر، جس کی پہلی علامت والدین ہیں۔ وہ رزق کو خدا کا عطیہ سمجھے اور خدائی نظام میں مداخلت نہ کرے، اس معاملہ میں آدمی کی گمراہی اس کو قتل اولاد اور تحدید نسل کی حماقت تک لے جاتی ہے۔ وہ فحش اور بے حیائی کے کاموں سے بچے تاکہ برائی کے بارے میں اس کے دل کی حساسیت زندہ رہے۔ وہ کم زور کا استحصال نہ کرے جس کا قریبی امتحان آدمی کے لئے یتیم کی صورت میں ہوتا ہے۔ وہ حقوق کی ادائگی اور لین دین میں ترازو کی طرح بالکل ٹھیک ٹھیک رہے۔ وہ اپنی زبان کا استعمال ہمیشہ حق کے مطابق کرے۔ وہ اس احساس کے ساتھ زندگی گزارے کہ ہر حال میں وہ عہد خداوندی میں بندھا ہوا ہے، وہ کسی بھی وقت خدائی عہد کی ذمہ داریوں سے آزاد نہیں ہے۔ یہی کسی آدمی کے لئے خدا کی پسند کے مطابق زندگی گزارنے کا سیدھا راستہ ہے۔ آدمی کو چاہئے کہ وہ دائیں اور بائیں بھٹکے بغیر اس سیدھے راستہ پر ہمیشہ قائم رہے۔

اوپر جو دس احکام (۱۵۳-۱۵۱) بیان ہوئے وہ سب سادہ فطری احکام ہیں۔ ہر آدمی کی عقل ان کے سچے ہونے کی گواہی دیتی ہے۔ اگر صرف ان چیزوں پر زور دیا جائے تو کبھی اختلاف اور فرقہ بندی نہ ہو۔ مگر جب قوموں پر زوال آتا ہے تو ان میں ایسے رہنما پیدا ہوتے ہیں جو ان سادہ احکام میں طرح طرح کی غیر فطری شقیں نکالتے ہیں۔ یہی وہ چیز ہے جو دینی اتحاد کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتی ہے۔

توحید میں اگر یہ بحث چھیڑی جائے کہ خدا جسم رکھتا ہے یا وہ بغیر جسم ہے یتیم کے معاملہ میں موشگافیاں کی جائیں کہ یتیم ہونے کی شرائط کیا ہیں۔ یا یہ نکتہ نکالا جائے کہ ان خدائی احکام پر اس وقت تک عمل نہیں ہو سکتا جب تک حکومت پر قبضہ نہ ہو۔ اس لئے سب سے پہلا کام "غیر اسلامی" حکومت کو بدلنا ہے ——— اس قسم کی بحثیں اگر شروع کر دی جائیں تو ان کی کوئی حد نہ ہوگی۔ اور ان پر عمومی اتفاق حاصل کرنا ناممکن ہو جائے گا۔ اس کے بعد مختلف فکری حلقے بنیں گے۔ الگ الگ فرقے اور جماعتیں قائم ہوں گی۔ باہمی اتفاق باہمی افتراق کی صورت اختیار کرلے گا۔

اس سادہ اور فطری دین پر اپنی ساری توجہ لگانا سب سے بڑی نیکی ہے۔ مگر اس کے لئے آدمی کو نفس سے لڑنا پڑتا ہے۔ ماحول کی ناسازگاری کے باوجود صبر اور قربانی کا ثبوت دیتے ہوئے اس پر جمے رہنا ہوتا ہے۔ یہ ایک بڑا پُرمشقت عمل ہے اس لئے اس کا بدلہ بھی خدا کے یہاں کئی گنا بڑھا کر دیا جاتا ہے۔ جو لوگ برائی کرتے ہیں، جو خدا کی دنیا میں خدا کے مقرر راستہ کے سوا دوسرے راستوں پر چلتے ہیں وہ اگرچہ بہت بڑا جرم کرتے ہیں۔ تاہم خدا ان کے خلاف انتقامی کارروائی نہیں کرتا۔ وہ ان کو اتنی ہی سزا دیتا ہے جتنا انھوں نے جرم کیا ہے۔

کہو میرے رب نے مجھ کو سیدھا راستہ بتا دیا ہے۔ دین صحیح ابراہیم کی ملت کی طرف جو یکسو تھے اور مشرکین میں سے نہ تھے۔ کہو میری نماز اور میری قربانی، میرا جینا اور میرا مرنا اللہ کے لئے ہے جو رب ہے سارے جہان کا۔ کوئی اس کا شریک نہیں۔ اور مجھے اسی کا حکم ملا ہے اور میں سب سے پہلے فرماں بردار ہوں۔ کہو، کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور رب تلاش کروں جب کہ وہی ہر چیز کا رب ہے اور جو شخص بھی کوئی کمائی کرتا ہے وہ اسی پر رہتا ہے۔ اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔ پھر تمھارے رب ہی کی طرف تمھارا لوٹنا ہے۔ پس وہ تمھیں بتا دے گا وہ چیز جس میں تم اختلاف کرتے تھے۔ اور وہی ہے جس نے تمھیں زمین میں ایک دوسرے کا جانشین بنایا اور تم میں سے ایک کا رتبہ دوسرے پر بلند کیا۔ تاکہ وہ آزمائے تم کو اپنے دئے ہوئے میں۔ تمھارا رب جلد سزا دینے والا ہے اور بے شک وہ بخشنے والا مہربان ہے ۶۵ - ۱۶۱

قرآن کی صورت میں خدا نے اپنا وہ بے آمیز دین نازل کر دیا ہے جو اس نے حضرت ابراہیم اور دوسرے پیغمبروں کو دیا تھا۔ اب جو شخص خدا کی رحمت و نصرت میں حصہ دار بننا چاہتا ہو وہ اس دین کو پکڑ لے، وہ اپنی عبادت کو خدا کے لئے خاص کر دے۔ وہ خدا سے قربانی کی سطح پر تعلق قائم کرے۔ وہ جئے تو خدا کے لئے جئے اور اس کو موت آئے تو اس حال میں آئے کہ وہ ہمہ تن خدا کا بندہ بنا ہوا ہو۔ عظیم کائنات اپنے تمام اجزاء کے ساتھ اطاعت خداوندی کے اسی دین پر قائم ہے۔ پھر انسان اس کے سوا کوئی دوسرا راستہ کیسے اختیار کر سکتا ہے۔ خدا کی اطاعت کی دنیا میں خدا کی سرکشی کا طریقہ اختیار کرنا کسی کے لئے کامیابی کا سبب کس طرح بن سکتا ہے۔ یہ معاملہ ہر شخص کا اپنا معاملہ ہے۔ کوئی نہ کسی کے انعام میں شریک ہو سکتا اور نہ کوئی کسی کی سزا میں۔ آدمی کو چاہئے کہ اس معاملہ میں وہ اسی طرح سنجیدہ ہو جس طرح دنیا میں کوئی مسئلہ کسی کا ذاتی مسئلہ ہو تو وہ اس میں آخری حد تک سنجیدہ ہو جاتا ہے۔

دنیا کا نظام یہ ہے کہ یہاں ایک شخص جاتا ہے اور دوسرا اس کی جگہ آتا ہے۔ ایک قوم پیچھے ہٹا دی جاتی ہے اور دوسری قوم اس کے بجائے زمین کے ذرائع و وسائل پر قبضہ کر لیتی ہے۔ یہ واقعہ بار بار یاد دلاتا ہے کہ یہاں کسی کا اقتدار دائمی نہیں۔ مگر انسان کا حال یہ ہے کہ جب کسی کو زمین پر موقع ملتا ہے تو وہ گزرے ہوئے لوگوں کے انجام کو بھول جاتا ہے۔ وہ اپنے ظلم اور سرکشی کو جائز ثابت کرنے کے لئے طرح طرح کے دلائل گھڑ لیتا ہے۔ مگر جب خدا حقیقتوں کو برہنہ کرے گا تو آدمی دیکھے گا کہ اس کی ان باتوں کی کوئی قیمت نہ تھی جن کو وہ اپنے موقف کے جواز کے کے لئے مضبوط دلیل سمجھے ہوئے تھا۔

دنیا میں آدمی کی سرکشی کی وجہ اکثر یہ ہوتی ہے کہ وہ دنیا کی چیزوں کو اپنے حق میں خدا کا انعام سمجھ لیتا ہے۔ حالانکہ دنیا میں جو کچھ کسی کو ملتا ہے وہ صرف بطور آزمائش ہے نہ کہ بطور انعام۔ دنیا کی چیزوں کو آدمی اگر انعام سمجھے تو اس کے اندر فخر پیدا ہوگا اور اگر وہ ان کو آزمائش سمجھے تو اس کے اندر عجز پیدا ہوگا۔ فخر کی نفسیات ڈھٹائی پیدا کرتی ہے اور عجز کی نفسیات اطاعت۔

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت رحم والا ہے

الف لام میم صاد۔ یہ کتاب ہے جو تمہاری طرف اتاری گئی ہے۔ پس تمہارا دل اس کے باعث تنگ نہ ہو تاکہ تم اس کے ذریعہ سے لوگوں کو ڈراؤ، اور وہ ایمان والوں کے لئے یاد دہانی ہے۔ جو اترا ہے تمہاری جانب تمہارے رب کی طرف سے اس کی پیروی کرو اور اس کے سوا دوسرے سرپرستوں کی پیروی نہ کرو۔ تم بہت کم نصیحت مانتے ہو۔ اور کتنی ہی بستیاں ہیں جن کو ہم نے ہلاک کر دیا۔ ان پر ہمارا عذاب رات کو آپہنچا یا دوپہر کو جب کہ وہ آرام کر رہے تھے۔ پھر جب ہمارا عذاب ان پر آیا تو وہ اس کے سوا کچھ نہ کہہ سکے کہ واقعی ہم ظالم تھے۔ پس ہم کو ضرور پوچھنا ہے ان لوگوں سے جن کے پاس رسول بھیجے گئے اور ہم کو ضرور پوچھنا ہے رسولوں سے۔ پھر ہم ان کے سامنے سب بیان کر دیں گے علم کے ساتھ اور ہم کہیں غائب نہ تھے۔ اس دن وزن دار صرف حق ہوگا۔ پس جن کی تولیں بھاری ہوں گی وہی لوگ کامیاب ٹھہریں گے اور جن کی تولیں ہلکی ہوں گی وہی لوگ ہیں جنھوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا، کیونکہ وہ ہماری نشانیوں کے ساتھ ناانصافی کرتے تھے ۹-۱

خدا کی کتاب اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے ایک نصیحت ہے۔ مگر وہ عملاً صرف ان تھوڑے سے لوگوں کے لئے نصیحت بنتی ہے جو اپنی فطری صلاحیت کو زندہ کئے ہوئے ہوں۔ بقیہ لوگوں کے لئے وہ صرف اس برے انجام سے ڈرانے کے ہم معنی ہو کر رہ جاتی ہے جس کی طرف وہ اپنی سرکشی کی وجہ سے بڑھ رہے ہیں۔ داعی یہ دیکھ کر تڑپتا ہے کہ جو چیز مجھے کامل صداقت کے روپ میں دکھائی دے رہی ہے اس کو بیشتر لوگ باطل سمجھ کر ٹھکرا رہے ہیں۔ جو چیز میری نظر میں پہاڑ سے بھی زیادہ اہم ہے اس کے ساتھ لوگ ایسا بے پروائی کا سلوک کر رہے ہیں جیسے اس کی کچھ حقیقت ہی نہ ہو، جیسے وہ بالکل بے اصل ہو۔

یہ دنیا امتحان کی دنیا ہے۔ یہاں ہر آدمی کے لئے موقع ہے کہ اگر وہ کسی بات کو نہ ماننا چاہے تو وہ اس کو نہ مانے، حتیٰ کہ وہ اس کو رد کرنے کے لئے خوبصورت الفاظ بھی پالے۔ مگر یہ صورت حال بالکل عارضی ہے۔ امتحان کی مدت ختم ہوتے ہی اچانک کھل جائے گا کہ داعی کی بات لوہے اور پتھر سے بھی زیادہ ثابت شدہ تھی۔ یہ صرف مخالفین کا تعصب اور ان کی انانیت تھی جس نے انھیں دلیل کو دلیل کی صورت میں دیکھنے نہ دیا۔ اس وقت کھل جائے گا کہ داعی حق کی باتوں کی رد میں جو دلیلیں وہ پیش کرتے تھے وہ محض دھاندلی تھی نہ کہ حقیقی معنوں میں کوئی استدلال۔

دنیا میں جو چیزیں کسی کو باوزن بناتی ہیں وہ یہ کہ اس کے گرد مادی رونقیں جمع ہوں۔ وہ الفاظ کے دریا بہانے کا فن جانتا ہو۔ اس کے ساتھ عوام کی بھیڑ اکٹھا ہو گئی ہو۔ چونکہ حق کے داعی کے ساتھ عام طور پر یہ اسباب جمع نہیں ہوتے اس لئے دنیا کے لوگوں کی نظر میں اس کی بات بے وزن اور اس کے مخالفوں کی بات وزن دار بن جاتی ہے۔ مگر قیامت جب مصنوعی پردوں کو پھاڑے گی تو صورت حال بالکل برعکس ہو جائے گی۔ اب سارا وزن حق کی طرف ہوگا اور ناحق بالکل بے دلیل اور بے قیمت ہو کر رہ جائے گا۔

اور ہم نے تم کو زمین میں جگہ دی اور ہم نے تمھارے لئے اس میں زندگی کا سامان فراہم کیا، مگر تم بہت کم شکر کرتے ہو۔ اور ہم نے تم کو پیدا کیا، پھر ہم نے تمھاری صورت بنائی۔ پھر فرشتوں سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ پس انھوں نے سجدہ کیا۔ مگر ابلیس سجدہ کرنے والوں میں شامل نہ ہوا۔ خدا نے کہا کہ تجھے کس چیز نے سجدہ کرنے سے روکا جب کہ میں نے تجھ کو حکم دیا تھا۔ ابلیس نے کہا کہ میں اس سے بہتر ہوں۔ تو نے مجھ کو آگ سے بنایا ہے اور آدم کو مٹی سے۔ خدا نے کہا کہ تو اتر یہاں سے۔ تجھے یہ حق نہیں کہ تو اس میں گھمنڈ کرے۔ پس نکل جا، یقیناً تو ذلیل ہے۔ ابلیس نے کہا کہ اس دن تک کے لئے تو مجھے مہلت دے جب کہ سب لوگ اٹھائے جائیں گے۔ خدا نے کہا کہ تجھ کو مہلت دی گئی۔ ابلیس نے کہا کہ چونکہ تو نے مجھے گمراہ کیا ہے، میں بھی لوگوں کے لئے تیری سیدھی راہ پر بیٹھوں گا۔ پھر ان پر آؤں گا ان کے آگے سے اور ان کے پیچھے سے اور ان کے دائیں سے اور ان کے بائیں سے، اور تو ان میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائے گا۔ خدا نے کہا کہ نکل یہاں سے ذلیل اور ٹھکرایا ہوا۔ جو کوئی ان میں سے تیری راہ پر چلے گا تو میں تم سب سے جہنم کو بھر دوں گا ۱۸—۱۰

خدا نے انسان کو اس دنیا میں جو کچھ دیا ہے اس لئے دیا ہے کہ اس کا نفسیاتی جواب وہ شکر کی صورت میں پیش کرے۔ مگر یہی وہ چیز ہے جس کو آدمی اپنے رب کے سامنے پیش نہیں کرتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ شیطان اس کے اندر دوسرے دوسرے جذبات ابھار کر اس کو شکر کی نفسیات سے دور کر دیتا ہے۔

آدم اور ابلیس کے قصہ سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا میں ہدایت اور گمراہی کا معرکہ کہاں برپا ہے۔ یہ معرکہ ان مواقع پر برپا ہے جہاں آدمی کے اندر حسد اور گھمنڈ کی نفسیات جاگتی ہیں۔ امتحان کی اس دنیا میں بار بار ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی دوسرے آدمی سے اوپر اٹھ جاتا ہے۔ کبھی کوئی شخص دولت و عزت میں دوسرے سے زیادہ حصہ پا لیتا ہے۔ کبھی دو آدمیوں کے درمیان ایسا معاملہ پڑتا ہے کہ ایک شخص کے لئے دوسرے کو اس کا جائز حق دینا اپنے کو نیچے گرانے کے ہم معنی نظر آتا ہے۔ کبھی کسی شخص کی زبان سے خدا ایک سچائی کا اعلان کراتا ہے اور وہ ان لوگوں کو اپنے سے برتر دکھائی دینے لگتا ہے جو اس سچائی تک پہنچنے میں ناکام رہے تھے۔ ایسے مواقع پر شیطان آدمی کے اندر حسد اور گھمنڈ کی نفسیات جگا دیتا ہے۔ "میں بہتر ہوں" کے جذبہ سے مغلوب ہو کر وہ اپنے بھائی کا اعتراف کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ یہی خدا کی نظر میں شیطان کے راستہ پر چلنا ہے۔ جس شخص نے ایسے مواقع پر حسد اور گھمنڈ کا طریقہ اختیار کیا اس نے اپنے کو جہنمی انجام کا مستحق بنا لیا جو شیطان کے لئے مقدر ہے اور جس نے ایسے مواقع پر شیطان کے پیدا کئے ہوئے جذبات کو اپنے اندر کچل ڈالا اس نے اس بات کا ثبوت دیا کہ وہ اس قابل ہے کہ اس کو جنت کے باغوں میں بسایا جائے۔

جو کچھ کسی کو ملتا ہے خدا کی طرف سے ملتا ہے۔ اس لئے کسی کی فضیلت کا اعتراف در اصل خدا کی تقسیم کے برحق ہونے کا اعتراف ہے اور اس کی فضیلت کو نہ ماننا خدا کی تقسیم کو نہ ماننا ہے۔ اسی طرح جب ایک شخص کسی حق کی بنا پر دوسرے کے آگے جھکتا ہے تو وہ کسی آدمی کے آگے نہیں جھکتا بلکہ خدا کے آگے جھکتا ہے۔ کیونکہ ایسا وہ خدا کے حکم کی بنا پر کر رہا ہے نہ کہ اس آدمی کے ذاتی فضل کی بنا پر۔

اور اے آدم، تم اور تمھاری بیوی جنت میں رہو اور کھاؤ جہاں سے چاہو۔ مگر اس درخت کے پاس نہ جانا ورنہ تم نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔ پھر شیطان نے دونوں کو بہکایا تاکہ وہ کھول دے ان کی وہ شرم کی جگہیں جو ان سے چھپائی گئی تھیں۔ اس نے ان سے کہا کہ تمھارے رب نے تم کو اس درخت سے صرف اس لئے روکا ہے کہ کہیں تم دونوں فرشتہ نہ بن جاؤ یا تم کو ہمیشہ کی زندگی حاصل ہو جائے۔ اور اس نے قسم کھا کر کہا کہ میں تم دونوں کا خیر خواہ ہوں ۲۱-۱۹

جنت اپنی تمام وسعتوں کے ساتھ آدم اور ان کی بیوی کے لئے کھلی ہوئی تھی۔ اس میں طرح طرح کی چیزیں تھیں اور خدا کی طرف سے ان کو آزادی تھی کہ ان کو جس طرح چاہیں استعمال کریں۔ بے شمار جائز چیزوں کے درمیان صرف ایک چیز کے استعمال سے روک دیا گیا تھا۔ شیطان نے اسی ممنوعہ مقام سے ان پر حملہ کیا۔ اس نے وسوسہ اندازیوں کے ذریعہ سکھایا کہ جس چیز سے تمھیں روکا گیا ہے وہی جنت کی اہم ترین چیز ہے۔ اسی میں تقدس اور ابدیت کا سارا راز چھپا ہوا ہے۔ آدم اور ان کی بیوی ابلیس کی مسلسل تلقین سے متاثر ہو گئے۔ اور بالآخر ممنوعہ درخت کا پھل کھا لیا۔ مگر جب انھوں نے ایسا کیا تو نتیجہ ان کی توقعات کے بالکل برعکس نکلا۔ ان کی اس خلاف ورزی نے خدا کا لباس حفاظت ان کے جسم سے اتار دیا۔ وہ اس دنیا میں بالکل بے یار و مددگار ہو کر رہ گئے جہاں اس سے پہلے ان کو ہر طرح کی سہولت اور حفاظت حاصل تھی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کا وہ خاص حربہ کیا ہے جس سے وہ انسان کو بہکا کر خدا کی رحمت و نصرت سے دور کر دیتا ہے۔ وہ ہے ـــــــ حلال رزق کے پھیلے ہوئے میدان کو آدمی کی نظر میں کمتر کر کے دکھانا اور جو چند چیزیں حرام ہیں ان کو خوبصورت طور پر پیش کر کے یقین دلانا کہ تمام بڑے بڑے فائدوں اور مصلحتوں کا راز بس انھیں چند چیزوں میں چھپا ہوا ہے۔

شیطان اپنا یہ کام ہر ایک کے ساتھ اس کے اپنے ذوق اور حالات کے اعتبار سے کرتا ہے۔ کسی کو تمام قیمتی غذاؤں سے بے رغبت کر کے یہ سکھاتا ہے کہ شاندار تندرستی حاصل کرنا چاہتے ہو تو شراب پیو۔ کہیں لاکھوں بے روزگار مرد کام کرنے کے لئے موجود ہوں گے مگر وہ ترغیب دے گا کہ اگر ترقی کی منزل تک جلد پہنچنا چاہتے ہو تو عورتوں کو گھر سے باہر لا کر انھیں مختلف تمدنی شعبوں میں سرگرم کر دو۔ کسی کے پاس اپنے مخالف کو زیر کرنے کا یہ قابل عمل طریقہ موجود ہو گا کہ وہ اپنے آپ کو مستحکم بنائے مگر شیطان اس کے کان میں ڈالے گا کہ تمھارے لئے اپنے مخالف کو شکست دینے کا سب سے زیادہ کارگر طریقہ یہ ہے کہ اس کے خلاف تخریبی کارروائیاں شروع کر دو۔ کسی کے لئے "اپنی تعمیر آپ" کے میدان میں کام کرنے کے لئے بے شمار مواقع کھلے ہوئے ہوں گے مگر وہ سکھائے گا کہ دوسروں کے خلاف احتجاج اور مطالبہ کا طوفان برپا کرنا اپنے کو کامیابی کی طرف لے جانے کا سب سے زیادہ قریبی راستہ ہے۔ کسی کے سامنے حکومت وقت سے تصادم کئے بغیر بے شمار دینی کام کرنے کے لئے موجود ہوں گے مگر وہ اس کو اس غلط فہمی میں ڈالے گا کہ غیر اسلامی حکمرانوں کو اگر کسی نہ کسی طرح پھانسی پر چڑھا دیا جائے یا ان کو گولی مار کر ختم کر دیا جائے تو اس کے بعد آناً فاناً اسلام کا مکمل نظام سارے ملک میں قائم ہو جائے گا، وغیرہ۔

پس مائل کر لیا ان کو فریب سے۔ پھر جب دونوں نے درخت کا پھل چکھا تو ان کی شرمگاہیں ان پر کھل گئیں۔ اور وہ اپنے کو باغ کے پتوں سے ڈھانکنے لگے اور ان کے رب نے ان کو پکارا کہ کیا میں نے تمھیں اس درخت سے منع نہیں کیا تھا اور یہ نہیں کہا تھا کہ شیطان تمھارا کھلا ہوا دشمن ہے۔ انھوں نے کہا، اے ہمارے رب ہم نے اپنی جانوں پر ظلم کیا اور اگر تو ہم کو معاف نہ کرے اور ہم پر رحم نہ کرے تو ہم گھاٹا اٹھانے والوں میں سے ہو جائیں گے۔ خدا نے کہا، اترو، تم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے، اور تمھارے لئے زمین میں ایک خاص مدت تک ٹھہرنا اور نفع اٹھانا ہے۔ خدا نے کہا، اسی میں تم جیو گے اور اسی میں تم مرو گے اور اسی سے تم نکالے جاؤ گے ۲۵ - ۲۲

آدم اور شیطان دونوں ایک دوسرے کے دشمن کی حیثیت سے زمین پر بھیجے گئے ہیں۔ اب قیامت تک دونوں کے درمیان یہی جنگ جاری ہے۔ شیطان کی مسلسل کوشش یہ ہے کہ وہ انسان کو اپنے راستہ پر لائے اور جس طرح وہ خود خدا کی رحمت سے محروم ہوا ہے انسان کو بھی خدا کی رحمت سے محروم کر دے۔ اس کے مقابلہ میں انسان کو یہ کرنا ہے کہ وہ شیطان کے منصوبہ کو ناکام بنا دے۔ وہ شیطان کی پکار کو نظر انداز کر کے خدا کی پکار کی طرف دوڑے۔

آدم اور شیطان کی یہ جنگ عملاً انسانوں میں دو گروہ بن جانے کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ کچھ لوگ شیطان کی ترغیبات کا شکار ہو کر اس کی صف میں شامل ہو جاتے ہیں۔ اور کچھ لوگ خدا کی آواز پر لبیک کہہ کر یہ خطرہ مول لیتے ہیں کہ شیطان کے تمام ساتھی اس کو بے عزت کرنے اور ناکام بنانے کے لئے ہر قسم کی تدبیریں کرنا شروع کر دیں۔ ہر دور میں یہ دیکھا گیا ہے کہ سچے حق پرست جو ہمیشہ کم تعداد میں ہوتے ہیں، لوگوں کی سخت ترین عداوتوں کا شکار رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی شیطان کی دشمنانہ کارروائیاں ہیں۔ وہ لوگوں کو سچے حق پرست آدمی کے خلاف بھڑکا دیتا ہے۔ وہ مختلف طریقہ سے لوگوں کے دل میں اس کے خلاف نفرت کی آگ بھرتا ہے۔ چنانچہ وہ شیطان کا آلۂ کار بن کر ایسے آدمی کو ستانا شروع کر دیتے ہیں۔

شیطان کا اصل جرم عدم اعتراف تھا۔ شیطان کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ ہر آدمی کے اندر یہی عدم اعتراف کا مزاج پیدا کر دے۔ وہ چھوٹے کو بھڑکاتا ہے کہ وہ اپنے بڑے کا لحاظ نہ کرے۔ معاملات کے دوران جب ایک شخص کے ذمہ دوسرے کا کوئی حق آتا ہے تو وہ اس کو سکھاتا ہے کہ وہ حق دار کا حق ادا نہ کرے۔ کوئی خدا کا بندہ سچائی کا پیغام لے کر اٹھتا ہے تو لوگوں کے دل میں طرح طرح کے شبہات ڈال کر انھیں آمادہ کرتا ہے کہ وہ اس کی بات نہ مانیں۔ دو فریقوں کے درمیان نزاع ہو اور ایک فریق اپنے حالات کے اعتبار سے کچھ دینے پر راضی ہو جائے تو شیطان فریق ثانی کے ذہن میں یہ ڈالتا ہے کہ اس کی پیش کش کو قبول نہ کرو، اور اتنا زیادہ کا مطالبہ کرو جو وہ نہ دے سکتا ہو۔ تاکہ جنگ و فساد مستقل طور پر جاری رہے۔

اس طرح شیطان کے بہکاووں سے ہر جگہ لوگوں کے درمیان دشمنیاں جاری رہتی ہیں۔ انسانوں میں دو گروہ بن جاتے ہیں اور ان میں ایسا ٹکراؤ شروع ہوتا ہے جو کبھی ختم نہیں ہوتا۔

انسان ذمہ دار وجود ہے

دوستو وسکی (۱۸۸۱-۱۸۲۱) مشہور روسی ناول نگار ہے۔ اس کا ایک کامیاب ناول "جرم و سزا" ہے۔ اس ناول کا ہیرو ایک بدمزاج، کریہہ المنظر اور لاولد بوڑھی عورت کو اس لئے قتل کر دیتا ہے کہ اس کی بڑھتی ہوئی بے کار دولت کو اپنی اعلیٰ تعلیم کے حصول کا ذریعہ بنا سکے۔ جب یہ واقعہ ہوتا ہے تو ناول کے تمام کردار اور خود ناول کا قاری اس کو مجرم قرار دیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ بڑھیا کی دولت اس کے قاتل کے لئے اتنی ہی مفید تھی جتنا کسی شیر کے لئے ہرن کا گوشت ہوتا ہے۔ مگر شیر ہرن کو مار کر اس کا خون پی جائے تو کسی کو یہ بات عجیب نہیں معلوم ہوتی اور نہ اس کے لئے کوئی تعزیری قانون بنانے کی ضرورت محسوس ہوتی۔ مگر اسی قسم کا فعل ایک انسان کرتا ہے تو ساری انسانیت چیخ اٹھتی ہے اور چاہتی ہے کہ قاتل کو اس کے فعل کی پوری سزا دی جائے۔

اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی وجہ صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ انسان کے متعلق یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ ایک ذمہ دار وجود ہے۔ اس کے ہر فعل کو صحیح اور غلط کی ترازو پر تولا جاتا ہے۔ جب کہ جانور اپنے اندر اس قسم کا کوئی اخلاقی شعور نہیں رکھتے۔ ان کے یہاں صرف مفید اور غیر مفید کی تقسیم ہے نہ کہ صحیح اور غیر صحیح کی۔ انسان ایک اخلاقی حیوان ہے جب کہ حیوان صرف حیوان۔

انسان اور حیوان کا یہ فرق بتاتا ہے کہ انسان اور حیوان کا معاملہ یکساں نہیں۔ حیوان کو اس کے اعمال کے لئے کسی اخلاقی عدالت میں کھڑا نہیں کیا جا سکتا۔ جب حیوان کو اعمال کے اخلاقی پہلوؤں کا شعور ہی نہیں تو اس کو اخلاق کی عدالت میں مجرم کیسے ٹھہرایا جا سکتا ہے۔ مگر انسان کا معاملہ سراسر مختلف ہے۔ انسان کے اندر معاملات کے بارہ میں اچھے اور برے کا احساس ہونا ہی یہ ثابت کرنے کے لئے کافی ہے کہ انسان اپنے اعمال کے لئے اخلاق کے سامنے جواب دہ ہے۔ جس فعل پر آدمی کا اپنا اندرونی ضمیر اس کو مجرم ٹھہرا رہا ہو اس کے لئے باہر کی عدالت میں مجرم ٹھہرانا عین فطری ہے۔

تاہم موجودہ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ یہاں کوئی ایسی عدالت نہیں جو آدمی کا اخلاقی احتساب کر سکے۔ یہاں آدمی اپنی مجرمانہ کارروائی کو خوبصورت الفاظ میں چھپا سکتا ہے وہ قانونی نکتے نکال کر اپنے کو عدالت کی گرفت سے بچا لیتا ہے۔ وہ زور و قوت کے ذریعہ اپنے خلاف تمام زبانوں کو بند کر دیتا ہے۔ یہ صورت حال بتاتی ہے کہ انسان کا اخلاقی احتساب کرنے والی عدالت دنیا کے موجودہ حالات میں قائم نہیں کی جا سکتی۔ اس کے لئے ایک اور دنیا درکار ہے جہاں وہ تمام مواقع کامل صورت میں جمع ہوں جو اس پیچیدہ کام کے لئے ضروری ہیں۔

جب دین مشتبہ ہو جائے

قرآن میں ارشاد ہوا ہے کہ شیاطین نے مشرکوں کی نگاہ میں اس بات کو مزین کر دیا ہے کہ وہ اپنی اولاد کو قتل کریں۔ اس طرح شیاطین ان کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں اور ان کے دین کو ان کے اوپر مشتبہ کر رہے ہیں (وکذٰلک زین لکثیر من المشرکین قتل اولادھم شرکاؤھم لیردوھم ولیلبسوا علیھم دینھم، انعام ۱۳۸)

عرب کے مشرک قبائل میں یہ رواج تھا کہ وہ مختلف نام سے اپنی اولاد کو قتل کر دیتے تھے۔ مثلاً کچھ لوگ سسر بننے کو اپنے لئے شرم کی چیز سمجھتے اور اپنی بیٹیوں کو قتل کر دیتے۔ کچھ لوگ افلاس کا شکار ہوتے اور اس اندیشہ کی بنا پر اپنی اولاد کو قتل کر دیتے کہ کیسے کھلائیں گے۔ کبھی ایسا ہوتا کہ منت مانتے کہ اگر اتنے بیٹے ہو جائیں یا فلاں مراد پوری ہو جائے تو ایک بیٹا فلاں بت کے نام پر ذبح کر دیں گے وغیرہ۔ یہ سراسر ظلم اور گمراہی کا فعل تھا۔ مگر وہ اس کو بڑی عبادت اور قربت کا ذریعہ خیال کرتے تھے۔

قتل اولاد کی یہ رسم پہلے یہود کے یہاں بھی پائی جاتی تھی۔ پھر وہ عرب قبائل میں رائج ہوئی۔ اس کی وجہ کیا تھی۔ اس کی وجہ تمام تر مذہبی تھی۔ دونوں حضرت ابراہیم کو اپنا سب سے بڑا بزرگ مانتے تھے۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ شیطان نے ان کو یہ رسم سنتِ ابراہیم کے طور پر سجھائی۔ انھوں نے حضرت اسماعیل کی قربانی کے واقعہ کی غلط تعبیر کر کے یہ سمجھا کہ اولاد کو قتل کرنا کوئی بڑا مقدس عمل ہے۔ یہ وہ عمل ہے جس کو خدا کے جلیل القدر پیغمبر حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے انجام دیا۔ اس کے نتیجہ میں آپ کے اوپر خدا کے غیر معمولی انعامات ہوئے، وہ بھول گئے کہ حضرت ابراہیم کا فعل براہ راست خدا کے خصوصی حکم کے تحت تھا۔ نیز آنجناب کو بھی وہ صرف خواب میں تمثیلی طور پر دکھایا گیا۔ عملاً اللہ نے ان سے جو چیز قبول کی وہ جانور کا ذبیحہ تھا۔ اور اولاد کا "ذبح" آپ کے لئے یہ قرار پایا کہ اپنے بیٹے کو کعبہ (خدا کے دین کی خدمت) کے لئے وقف کر دیں۔

حضرت ابراہیم کے واقعہ میں اصل نمونہ یہ تھا کہ اپنے بیٹے کو صرف دنیا کمانے کا ذریعہ نہ بناؤ۔ بلکہ اس کو خدا کے دین کی خدمت میں لگاؤ۔ یہ آخرت کی طلب میں دنیا کی طلب کو قربان کرنا تھا۔ یہ اپنے ذاتی مستقبل کی تعمیر کے بجائے دین کی تعمیر سے خوشی حاصل کرنے کا پیغام تھا۔ مگر شیطان نے سنت ابراہیمی کے نام پر لوگوں کو ایک لایعنی رسم میں الجھا دیا۔ لوگ خدا کا نام لیتے ہوئے شیطان کے راستہ پر چل پڑے۔ یہی دین کو لوگوں کے اوپر مشتبہ کرنا ہے۔

یہ شیطان کے طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے کہ وہ اصل دین کے بارے میں لوگوں کے اندر اشتباہ پیدا کر دیتا ہے۔ وہ ایک دینی چیز کو لے کر اس کی غلط تصویر لوگوں کے ذہن میں بٹھاتا ہے۔ وہ لوگوں کو آمادہ کرتا ہے کہ وہ دین کے نام پر بے دینی کا فعل شروع کر دیں۔ وہ حقیقۃً دین سے دور ہوں مگر ایک بیہودہ عمل کر کے یہ سمجھیں

کہ وہ عین دین خداوندی کی تکمیل کر رہے ہیں۔

عرب کے مشرکین نے حضرت ابراہیم کے ایک واقعہ سے غلط طور پر ذبح اولاد کی رسم نکالی۔ یہود نے حضرت سلیمان کی زندگی کے ایک پہلو کو جادو اور عملیات کا کاروبار کرنے کے حق میں استعمال کیا۔ عیسائیوں نے حضرت مسیح کی غیر شادی شدہ زندگی سے ترک نکاح کا مقدس طریقہ اخذ کر لیا۔ یہ سب سراسر گم راہی کے فعل ہیں۔ وہ بظاہر نبی کے ایک فعل سے مشابہ ہونے کے باوجود نبی کی تعلیمات کے بالکل خلاف ہیں۔ تاہم جن لوگوں نے ان کو اختیار کیا وہ لوگوں کو یہی باور کراتے رہے کہ وہ پیغمبر کے اسوہ پر عمل کر رہے ہیں۔

اس طرح شیطان لوگوں کو ایک دینی عمل کے نام پر کسی لایعنی کام میں الجھا دیتا ہے۔ وہ دین کے معاملہ میں لوگوں کو مشتبہ کر کے ان کو دین سے دور کر دیتا ہے۔ وہ ایک بے دینی کے کام میں مشغول ہو جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ عین دینی کام کر رہے ہیں۔

یہ معاملہ صرف پچھلی قوموں کے ساتھ مخصوص نہیں۔ امت مسلمہ کے افراد بھی مختلف طریقوں سے اس بے راہی میں پڑ سکتے ہیں۔ وہ پیغمبر اسلام کی زندگی یا آپ کی تعلیمات کے کسی پہلو کی غلط تعبیر کر کے دین میں ایسی بدعت داخل کر سکتے ہیں جس پر بظاہر دین کا لیبل لگا ہوا ہو مگر اس کا دین خداوندی سے کوئی تعلق نہ ہو۔ وہ اپنی خواہشات پر چلیں اور اس کو دین کی اصطلاحوں میں بیان کریں۔ وہ دنیا پرستانہ سیاست چلائیں اور اس کو آخرت کا راستہ قرار دیں۔ وہ اپنے قومی جذبات کے تحت اٹھیں اور یہ ظاہر کریں کہ وہ عین اسلام کی خاطر ایسا کر رہے ہیں۔

ایسے لوگوں کو عام طور پر بہت جلد مقبولیت حاصل ہو جاتی ہے۔ کیونکہ وہ خدا کے دین کو اس سطح پر اتار لاتے ہیں جہاں لوگ عملاً جی رہے ہیں۔ وہ لوگوں کی خواہش پرستی کے لئے دینی جواز فراہم کر دیتے ہیں۔ لوگ اس غلط فہمی میں رہتے ہیں کہ اپنی جگہ سے کھسکے بغیر وہ دین کو اس کی کامل صورت میں پا گئے ہیں۔ دین کو کچھ دئے بغیر انھوں نے اس کا سب کچھ حاصل کر لیا ہے۔

دین کی ایک حقیقت ہے اور اس کے کچھ خارجی مظاہر۔ مظاہر کو اگر حقیقت کی روشنی میں سمجھا جائے تو ہر چیز اپنے صحیح مقام پر رہتی ہے۔ اس کے برعکس اگر حقیقت کو مظاہر کی روشنی میں دیکھا جانے لگے تو عجیب عجیب تعبیرات ظہور میں آتی ہیں۔ اب خدا کا پیغمبر کسی کو اشتراکی لیڈر دکھائی دینے لگتا ہے۔ قرآن کسی کے لئے دنیوی معاملات کی کنجی بن جاتا ہے۔ کوئی جماعت کی نماز کو فوجی ٹریننگ سمجھ لیتا ہے۔ کسی کو پورا دین سیاست کے روپ میں نظر آتا ہے۔ اس طرح ہر آدمی دین کی الگ الگ تصویر بنا لیتا ہے جو اس کے اپنے ذہن کے پوری طرح مطابق ہوتی ہے مگر اصل حقیقت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

آپ کا حصہ آپ کو مل کر رہے گا

عبد اللہ بن مسعود رضؓ کا بیان ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

أَيُّهَا النَّاسُ لَيْسَ مِنْ شَيْءٍ يُقَرِّبُكُمْ إِلَى الْجَنَّةِ وَيُبَاعِدُكُمْ مِنَ النَّارِ إِلَّا قَدْ أَمَرْتُكُمْ بِهِ وَلَيْسَ مِنْ شَيْءٍ يُقَرِّبُكُمْ مِنَ النَّارِ وَيُبَاعِدُكُمْ مِنَ الْجَنَّةِ إِلَّا قَدْ نَهَيْتُكُمْ عَنْهُ وَإِنَّ الرُّوحَ الْأَمِينَ نَفَثَ فِي رُوعِي أَنَّ نَفْسًا لَنْ تَمُوتَ حَتَّى تَسْتَكْمِلَ رِزْقَهَا أَلَا فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَجْمِلُوا فِي الطَّلَبِ وَلَا يَحْمِلَنَّكُمُ اسْتِبْطَاءُ الرِّزْقِ أَنْ تَطْلُبُوهُ بِمَعَاصِي اللَّهِ فَإِنَّهُ لَا يُدْرَكُ مَا عِنْدَ اللَّهِ إِلَّا بِطَاعَتِهِ

(مشکوٰۃ، باب التوکل والصبر)

اے لوگو! جنت سے قریب کرنے والی جتنی چیزیں ہیں اور دوزخ سے دور کرنے والی جتنی چیزیں ہیں ان سب کا میں تمھیں حکم دے چکا ہوں۔ اسی طرح دوزخ سے قریب کرنے والی جتنی چیزیں ہیں اور جنت سے دور کرنے والی جتنی چیزیں ہیں ان سب سے تمھیں منع کر چکا ہوں۔ اور جبریل امین نے میرے دل میں یہ خیال ڈالا ہے کہ کوئی شخص ہرگز مر نہیں سکتا جب تک وہ اپنے حصے کا رزق نہ پالے۔ تو آگاہ، تم لوگ خدا سے ڈرو اور تلاش رزق میں جمیل طریقوں سے کام لو اور اگر رزق آنے میں کچھ دیر لگے تو اس کی وجہ سے تم معصیت کی راہ سے اس کو حاصل کرنے کی طرف مائل نہ ہو جاؤ کیونکہ خدا کے پاس جو کچھ ہے اس کو اس کی اطاعت ہی کے ذریعہ حاصل کیا جا سکتا ہے۔

صحیح زندگی چھوڑ کر غلط زندگی اختیار کرنے کا محرک اکثر حالات میں یہی ہوتا ہے کہ آدمی دنیا میں اپنے لئے زیادہ سے زیادہ حاصل کر سکے۔ اس لئے فرمایا کہ دنیا میں جو کچھ تم حاصل کرتے ہو وہ محض تمھاری اپنی کوششوں کا حاصل نہیں ہوتا بلکہ وہ دراصل تمھارا وہ حصہ ہوتا ہے جو پہلے سے تمھارے لئے مقدر ہو چکا ہے، اس لئے حصولِ معاش کی جدوجہد میں دوسرے فرائض کو نہ بھولو اور اس کے لئے اتنا بدحواس نہ ہو جاؤ کہ خدا کی مقرر کی ہوئی حدوں کو توڑنے لگو۔ یہ حقیقت ہمیشہ یاد رکھو کہ دنیا کے لئے آدمی کی بے قراری یا حرام ذریعوں سے حاصل کرنے کی کوشش اس کو مزید کچھ نہیں دے سکتی۔ وہ صرف اس کی بدبختی میں اضافہ کرے گی۔

حصولِ معاش کی جدوجہد میں ہمیشہ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ جو کچھ کسی کو ملتا ہے وہ خدا کی طرف سے ملتا ہے۔ ہماری کوششیں ہمارے لئے استحقاق پیدا کرتی ہیں نہ کہ وہی بذات خود نتیجہ پیدا کرنے والی ہیں۔

اس معاملہ کو تعلیمی امتحان کی مثال سے سمجھا جا سکتا ہے۔ کسی شخص کی امتحان میں داخلہ کی درخواست کو قبول کرنا یہ معنی رکھتا ہے کہ امتحان ہال میں اس کو ایک نشست دی جائے گی۔ اور اسی کے ساتھ اس کے لئے وہ تمام سامان فراہم کئے جائیں گے جو امتحان دینے کے لئے ضروری ہیں۔ اس مثال سے موجودہ دنیا میں زندگی کی حقیقت کو سمجھا جا سکتا ہے۔ یہ دنیا دار الامتحان ہے اور ہمارا یہاں پیدا ہونا گویا اپنے آپ کو امتحان میں شامل کرنا ہے۔

خلق قرآن

قدیم عیسائی متکلمین نے اپنی فلسفیانہ موشگافیوں کے تحت یہ مسئلہ پیدا کیا تھا کہ خدا کا کلام ذاتِ خداوندی کا حصہ ہے یا عام مخلوقات کی طرح وہ ذاتِ خداوندی سے الگ ہے۔ انھوں نے اس کو ذاتِ خداوندی کا حصہ قرار دیا۔ نئے عہدنامہ میں یوحنا کی انجیل کا پہلا فقرہ یہ ہے ——— "ابتدا میں کلام تھا۔ اور کلام خدا کے ساتھ تھا۔ اور کلام خدا تھا۔ یہی ابتدا میں خدا کے ساتھ تھا۔ سب چیزیں اس کے وسیلہ سے پیدا ہوئیں۔ اور جو کچھ پیدا ہوا ہے اس میں سے کوئی چیز بھی اس کے بغیر پیدا نہیں ہوئی۔"

دوسری صدی ہجری میں جو معتزلی علماء پیدا ہوئے وہ قدیم فلسفیانہ طرز فکر سے متاثر تھے اور عقائد میں موشگافیاں کر کے نئے نئے مسائل پیدا کرنے کا خاص ذوق رکھتے تھے۔ چنانچہ عیسائی متکلمین کی پیروی میں انھوں نے اسلام میں بھی اسی قسم کی بحثیں شروع کیں۔ اسی ذیل میں انھوں نے وہ عقیدہ نکالا جو خلق قرآن کے نام سے مشہور ہے۔ خلق قرآن کا مطلب ان کے نزدیک یہ تھا کہ جس طرح سورج، چاند وغیرہ سب خدا کی مخلوقات ہیں ٹھیک اسی طرح قرآن بھی خدا کی ایک مخلوق ہے۔ خدا نے سارے عالم کو کن فیکون کے ذریعہ پیدا کیا ہے اسی طرح اس نے قرآن کو بھی کن فیکون کے ذریعہ پیدا کیا ہے۔ اس مسئلہ میں انھوں نے اتنا غلو کیا کہ اس کو کفر و ایمان کا معیار بنا دیا۔ ان کے نزدیک جو شخص قرآن کو مخلوق (پیدا کیا ہوا) کہے وہ مومن تھا اور جو اس کو مخلوق نہ کہے وہ کافر۔ امام احمد بن حنبل اور محدثین کی ایک جماعت نے اس معاملہ میں معتزلہ کے بالکل برعکس مسلک اختیار کیا۔ انھوں نے معتزلہ کے نقطۂ نظر کی شدت کے ساتھ تردید کی اور کہا کہ قرآن غیر مخلوق ہے۔ یعنی وہ کسی وقت خاص میں پیدا نہیں کیا گیا۔ بلکہ جس طرح خدا کی ذات ہمیشہ سے ہے اسی طرح اس کا کلام بھی ہمیشہ سے ہے۔

خلق قرآن کا مسئلہ باعتبار حقیقت کفر و اسلام کا مسئلہ نہ تھا۔ یہ محض ایک تفنن یا بے فائدہ قسم کی موشگافی تھی۔ چنانچہ امام بخاری (۱۹۴-۲۵۶ھ) اس معاملہ میں خاموشی کو پسند کرتے تھے۔ امام بخاری جب نیشاپور پہنچے تو کچھ لوگوں نے الفاظ قرآن کے بارے میں ان کی رائے پوچھی۔ امام صاحب نے ٹال دیا۔ پھر پوچھا گیا تو پھر ٹال دیا۔ مگر بار بار کے سوال پر ان کو اس موضوع پر بولنا پڑا۔ کہا جاتا ہے کہ امام بخاری نے اس سوال کے جواب میں فرمایا:

القرآن کلام اللہ غیر مخلوق۔ الفاظنا من افعالنا و افعالنا مخلوقۃ۔ والامتحان عنہ بدعۃ

قرآن اللہ کا کلام غیر مخلوق ہے۔ الفاظ ہمارے افعال میں سے ہیں اور ہمارے افعال مخلوق ہیں۔ اس مسئلہ میں کسی کی آزمائش کرنا بدعت ہے۔

امام بخاری کے اس قول کا مطلب یہ تھا کہ قرآن کلام الٰہی ہے اور اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ مگر اس کو پڑھتے وقت ہم اپنی زبان سے جو الفاظ نکالتے ہیں وہ ہمارا اپنا فعل ہوتا ہے۔ اس طرح انھوں نے متلو اور تلاوت کے درمیان فرق کیا۔ متلو فعل الٰہی تھا اس لئے قدیم تھا۔ اور تلاوت انسانی فعل تھا اس لئے وہ حادث تھا (کتاب الاسماء والصفات)

تاہم بہت سے دوسرے محدثین خصوصاً امام احمد بن حنبل نے اس معاملہ میں بہت شدید رویہ اختیار کیا۔ معتزلہ کہتے تھے کہ قرآن مخلوق ہے۔ یعنی خدا کی ذات کی طرح قدیم نہیں ہے۔ بلکہ ایک خاص وقت میں خدا نے اس کو خلق کیا ہے جس طرح سورج چاند کو ایک خاص وقت میں خلق کیا ہے۔ امام حنبل اور دوسرے علماء قرآن کو غیر مخلوق (اللہ کی ذات کی طرح قدیم) کہتے تھے۔ ان کے پیروؤں نے ان کے بعد مزید غلو کیا۔ چنانچہ حنابلہ کا یہ مسلک نقل کیا گیا ہے کہ وہ قرآن مجید کی روشنائی اور اس کے اوراق کو بھی قدیم مانتے تھے۔ اس مسلک کے بعض لوگوں نے یہاں تک کہا کہ جس قلم سے قرآن مجید لکھا گیا وہ بھی قدیم ہے۔ بعد کے دور میں جب حکمراں طبقہ حنابلہ پر مہربان ہو گیا اور حکومت پر ان کا اثر قائم ہو گیا تو امام بخاری کو امام حنبل سے مختلف مسلک رکھنے کی بنا پر قید و بند کی تکلیفیں بھی برداشت کرنی پڑیں۔

مسئلہ کی فنی نوعیت سے قطع نظر، امام حنبل وغیرہ نے جب اس معاملہ میں معتزلہ کے مسلک سے علیحدہ مسلک پر اصرار کیا تو خلیفہ مامون الرشید (۱۹۸ — ۲۱۸ھ) کو اپنا ایک سیاسی مقصد حاصل کرنے کا قیمتی موقع ہاتھ آگیا۔ کیونکہ وہ محدثین کو حکومت سے الگ راستہ بنانے پر سزا دینا چاہتا تھا۔ چنانچہ وہ محدثین کی رائے کے برعکس معتزلہ کی رائے کا پرجوش مبلغ بن گیا۔ ۲۱۸ھ میں مامون الرشید نے مختلف شہروں میں اپنے حاکموں کے نام فرمان جاری کیا کہ علماء و محدثین کو جمع کر کے ان سے خلق قرآن کے عقیدہ کا اقرار کرایا جائے اور جو اقرار نہ کرے اس کو سخت سزا دی جائے۔

خلیفہ مامون ابھی اپنے مشن کو پورا نہیں کر پایا تھا کہ اس کا انتقال ہو گیا۔ اس نے انتقال کے وقت اپنے جانشین کو وصیت کی کہ وہ محدثین کے سامنے خلق قرآن کا مسئلہ پیش کرے اور ان میں سے جو لوگ اس کی تصدیق نہ کریں ان کو سخت سزا دے۔ مامون کے بعد معتصم باللہ خلیفہ ہوا۔ اس نے اپنے پیش رو کی وصیت پر پورا پورا عمل کیا۔ مختلف علماء کو اس عقیدہ سے انکار کی بنا پر سخت سزائیں دی گئیں۔ ان سزاؤں کا سب سے زیادہ نشانہ امام احمد بن حنبل (۱۶۴ - ۲۴۱ھ) بنے جو اس وقت اس رائے کی مخالفت کرنے والوں کی علامت بن گئے تھے۔ امام صاحب کو رقہ سے بغداد لایا گیا۔ پہلے خلق قرآن کے مبلغ علماء سے مناظرہ ہوا۔ جب مناظرہ کے ذریعہ وہ ان کو قائل نہ کر سکے تو ڈرانے دھمکانے کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس کے بعد کوڑے مارے جانے لگے اور بھاری بیڑیاں پہنا دی گئیں۔ محمد بن اسماعیل بخاری کہتے ہیں کہ میں نے سنا کہ امام احمد بن حنبل کو اتنے کوڑے مارے گئے کہ اگر اتنے کوڑے ہاتھی کو مارے جاتے تو ہاتھی بھی چیخ اٹھتا۔

خلق قرآن کا مسئلہ بظاہر اتنا بے معنی ہے کہ بہت سے لوگوں کے لئے یہ سمجھنا بھی مشکل ہے کہ معتزلہ نے ایسا عقیدہ کیوں گھڑا اور وقت کے حکمرانوں نے اس پر یقین کیسے کر لیا۔ مگر اس وقت کے معتزلی علماء نے اس بے معنی عقیدہ کے حق میں بھی قرآن سے دلیل فراہم کر لی تھی۔ قاضی احمد بن دواد معتزلی نے اس کی دلیل یہ پیش کی کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: انا جعلناہ قرآناً عربیاً (ہم نے بنایا ہے اس کو عربی قرآن) اس نے کہا کہ جعل کے معنی خلق یعنی پیدا

کرنے کے بھی ہوتے ہیں۔ جیسا کہ قرآن میں ہے جعل الظلمات والنور (خدا نے بنائی تاریکی اور روشنی) اس سے ثابت ہوا کہ قرآن "مجعول" ہے، بالفاظ دیگر وہ مخلوق ہے جس طرح روشنی اور تاریکی مخلوق ہیں۔

اس دلیل کی کمزوری اتنی چھپی ہوئی نہ تھی کہ اس کو وہ لوگ سمجھ نہ سکیں جو اپنے وقت میں دنیا کی سب سے بڑی حکومت چلا رہے تھے۔ اصل یہ ہے کہ تین عباسی خلفاء ـــــ مامون، معتصم اور واثق ـــــ نے امام حنبل اور دوسرے علماء پر جو مظالم کئے اس کی وجہ تمام تر سیاسی تھی۔ اس طرح وہ اپنے مفروضہ سیاسی حریفوں کو مذہب کے نام پر سزائیں دے رہے تھے۔

حدیث کی جمع و تدوین کے کام کا آغاز حضرت عمر بن عبدالعزیز (۱۰۱ ـ ۶۲ ھ) نے اپنے زمانۂ خلافت میں کیا۔ مگر آپ کی خلافت کی مدت صرف ڈھائی سال رہی اس لئے آپ اس کام کی تکمیل نہ فرما سکے اور اس دنیا سے چلے گئے۔ آپ کے بعد خلافت کا ادارہ دنیادار بادشاہوں کے قبضہ میں آگیا۔

دوسری صدی ہجری میں محدثین نے حدیث کی تدوین کا کام شروع کیا تو انھوں نے انتہائی دیانت داری کے ساتھ ہر قسم کی روایتیں جمع کرنی شروع کیں اور اس کا مطلق لحاظ نہ کیا کہ کون سی روایت کس کے موافق پڑتی ہے اور کس کے خلاف۔ قدرتی طور پر وقت کے مسلم سلاطین کو یہ بات ناگوار تھی۔ کیونکہ حدیث کے دفتر میں بہت سی ایسی روایتیں بھی محفوظ ہو رہی تھیں جن کی زد ان کی عیش پرستی اور ان کی ظالمانہ سیاست پر پڑتی تھی۔ اس بنا پر حدیث کو وہ اپنے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ سمجھنے لگے۔ انھوں نے چاہا کہ حدیث کی جمع و تدوین کا کام ان کی سرپرستی میں ہو تاکہ اس کو اپنی مصلحتوں کے مطابق ڈھالا جا سکے۔ مگر محدثین نے اس مقدس کام میں کسی بھی قسم کے شاہی اثر و نفوذ کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

یہ تھی اصل بات جس کی وجہ سے وقت کے حکمراں محدثین کرام سے خوش نہ تھے۔ مگر محدثین کو اس نام پر سزا دینا ممکن نہ تھا کہ وہ حدیث کی جمع و تدوین کے کام میں شاہی مصلحتوں کی رعایت نہیں کر رہے ہیں۔ چنانچہ وہ کسی ایسے سبب کی تلاش میں تھے جس کو بہانہ بنا کر محدثین کو ان کی "باغیانہ روش" کی سزا دی جا سکے۔ خلق قرآن کے مسئلہ نے یہ موقع دے دیا۔ معتزلی علماء نے جب یہ عقیدہ نکالا کہ قرآن مخلوق ہے تو اکثر محدثین نے آگے بڑھ کر اس کو غلط قرار دے دیا۔ وقت کے خلیفہ نے فوراً اس موقع کو استعمال کیا۔ اس نے اس عقیدہ کو اسلامی حکومت کا سرکاری عقیدہ قرار دے کر محدثین پر اس سے منحرف ہونے کا الزام عاید کر دیا۔ اس طرح ان کو اعتقادی مجرم ٹھہرا کر انھیں کوڑے مارے جانے لگے۔

مسئلہ خلق قرآن پر محدثین کو دی جانے والی سزا در اصل ایک سیاسی سزا تھی جو دین کے نام پر دی گئی۔ اس معاملہ کو موجودہ زمانہ کے ان مسلم حکمرانوں کی مثال سے بآسانی سمجھا جا سکتا ہے جو اپنے سیاسی مخالفوں کو دین کے نام پر کوڑے اور قتل کی سزائیں دے رہے ہیں۔ سیاسی جرم کی دینی سزا ہر زمانہ میں رائج رہی ہے۔ البتہ حالات کے اعتبار سے ہر زمانہ میں اس کے عنوان مختلف ہو جاتے ہیں۔

حوصلہ مندی

اصمعی دوسری صدی ہجری کا مشہور لغوی عالم ہے۔ اس کو عربی الفاظ کا لغت جمع کرتے ہوئے دَمْدَمَ کے معنی کی تلاش ہوئی۔ یہ لفظ قرآن میں بھی استعمال ہوا ہے (فدمدم علیہم ربہم بذنبہم فسواھا) اصمعی یہ جاننا چاہتا تھا کہ اس لفظ کا خاص مفہوم کیا ہے اور عرب اس کو کس موقع پر استعمال کرتے ہیں۔ وہ ایسا کر سکتا تھا کہ کسی بدو کو پکڑتا اور اس سے پوچھتا کہ تم لوگ دَمْدَمَ کا لفظ کس موقع پر بولتے ہو۔ مگر وہ جو کچھ بتاتا وہ اصمعی کو خود بھی معلوم تھا۔ اصمعی کو تو اصل میں یہ جاننا تھا کہ وہ کون سا موقع ہے جب کہ ایک عرب بے ساختہ طور پر یہ لفظ بول پڑتا ہے۔ اور یہ بات پوچھ کر جانی نہیں جا سکتی۔ وہ تو صرف اس طرح جانی جا سکتی ہے کہ فطری حالات میں ایسا کوئی لمحہ آئے جب کہ ایک عرب یہ لفظ بولے اور وہاں وہ سننے کے لئے موجود ہو۔

اس مقصد کے لئے اصمعی ایک خانہ بدوش عرب خاندان کے ساتھ لگ گیا۔ وہ خاندان جہاں جاتا اسی کے ساتھ اصمعی بھی اس کے ساتھ ہوتا اور ہر وقت اس انتظار میں رہتا کہ کب وہ موقع آئے جب کہ عرب بدو بے ساختہ طور پر یہ لفظ بول پڑے۔ وہ یہاں وہاں پھرتا رہا۔ یہاں تک کہ اسی میں تقریباً چھ ماہ گزر گئے اور بدو کی زبان سے دَمْدَمَ کا لفظ اس کو سننے کو نہ ملا۔ آخر ایک روز ایسا ہوا کہ بدو نے ایک مقام پر اپنا خیمہ گاڑ رکھا تھا۔ خیمہ کے اندر سالن کی ہانڈی آگ پر چڑھی ہوئی تھی، بدو مرد خیمہ کے اندر تھا اور اس کی عورت خیمہ کے باہر کوئی کام کر رہی تھی۔ پکتے پکتے ہانڈی نقطہ جوش پر آئی اور اس میں ابال آگیا۔ عرب بدو نے یہ دیکھ کر اپنی بیوی کو خبردار کرنے کے لئے بآواز بلند کہا: دَمْدَمَتْ (ہانڈی ابل گئی) اصمعی نے یہ سنا تو چلاتے ہوئے خیمہ سے نکل پڑا:

واللّٰہِ وجدت واللّٰہِ وجدتُ (خدا کی قسم میں پا گیا خدا کی قسم میں پا گیا)

اس واقعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کون سا شوق اور حوصلہ مندی تھی جس کی وجہ سے دور اول کے مسلمانوں نے بڑے بڑے کارنامے انجام دئے۔ یہ تھا فائدہ اور شہرت کی چاشنی کے بغیر صرف مقصد کی خاطر محنتیں کرنا۔ موجودہ زمانہ میں بھی بے شمار سرگرمیاں جاری ہیں مگر وہ سب بے نتیجہ ہوتی جا رہی ہیں۔ کیونکہ آج کا آدمی صرف وہاں سرگرم ہوتا ہے جہاں ذاتی فائدہ یا ذاتی شہرت و مقبولیت کی چاشنی ہو۔ صرف مقصد کی خاطر متحرک ہونا کوئی نہیں جانتا۔

جس قوم کے افراد میں اس قسم کا شوق اور حوصلہ ہو وہی قومیں آگے بڑھتی ہیں۔ ابتدائی دور میں مسلمانوں کے اندر یہی بلند حوصلگی تھی جس کی وجہ سے مسلمان اُس زمانہ میں دنیا کے سب سے طاقت ور گروہ بن گئے۔ موجودہ زمانہ میں سطحیت اور خود پسندی اتنی بڑھ گئی ہے کہ کوئی اس قسم کی "بے فائدہ" محنت میں اپنا وقت ضائع کرنا پسند نہیں کرتا۔ اور بلاشبہ یہی اخلاقی زوال موجودہ زمانہ کے مسلمانوں کی پستی کی سب سے بڑی وجہ ہے۔

عام انسان کو یا خوف متحرک کرتا ہے یا خود غرضی۔ مگر ایسے لوگ کوئی تاریخ نہیں بناتے۔ تاریخ صرف وہ لوگ بناتے ہیں جو حوصلہ اور مقصد کی خاطر متحرک ہونا جانتے ہوں۔

معیار کی تبدیلی

ہجرت کے دوسرے سال بدر کے مقام پر مسلمانوں میں اور قریش میں جنگ ہوئی۔ قریش کی سرداری ابوجہل کو حاصل تھی۔ جنگ سے ایک دن پہلے اس نے خدا سے اپنی فتح کی دعا کی تو اس کی زبان سے یہ الفاظ نکلے: خدایا، دونوں فریقوں میں سے جو سب سے زیادہ رشتہ رحم کا کاٹنے والا ہو تو کل کے دن اس کو ہلاک کردے (اللھم اقطعنا للرحم فاحنہ الغداۃ)

ابوجہل کو خدا سے یہ کہنا تھا کہ وہ قریش کو مسلمانوں کے اوپر فتح دے۔ اس کی یہ بات اسی وقت باوزن ہوسکتی تھی جب کہ وہ یہ بھی دکھا سکے کہ مسلمانوں کے مقابلہ میں اس کا گروہ حق پر ہے۔ اس مقصد کے لئے اس نے قطع رحم کو فیصلہ کی بنیاد بنایا۔ کیونکہ اسلام کی دعوت نے قریش کے خاندانوں میں باپ کو بیٹے سے اور بھائی کو بھائی سے جدا کر دیا تھا۔ اس معیار پر جانچنے کی صورت میں یہ ثابت ہوتا تھا کہ اس کا اپنا گروہ حق پر ہے اور مسلمانوں کا گروہ باطل پر۔ روس کے سابق وزیر اعظم نکیتا خروشچوف نے بھی اسی طریقہ کو اختیار کرتے ہوئے خدا کے وجود سے انکار کر دیا تھا۔ انھوں نے یہ معیار قائم کیا کہ خدا اگر ہے تو اس کو چاند پر سے نظر آنا چاہئے۔ جب روس کے راکٹ نے اپنے چاند کے سفر کی رپورٹ میں خدا کا کوئی نشان نہیں بتایا تو خروشچوف نے اعلان کر دیا: خدا کا کوئی وجود نہیں، کیونکہ ہمارا راکٹ چاند تک گیا مگر اس کو کہیں خدا نظر نہیں آیا۔

یہی غلطی مختلف شکلوں میں خود اسلام میں پیدا ہوسکتی ہے۔ کون اسلام پر ہے اور کون اسلام پر نہیں ہے۔ اس کا ایک خدائی معیار ہے۔ لیکن اگر آپ اس معیار کو بدل دیں تو آپ کے لئے سارا معاملہ کچھ سے کچھ ہو جائے گا۔ آپ اپنے ذاتی معیار کی بنا پر دین کو بے دینی سمجھ لیں گے اور بے دینی کو دین۔

اگر آپ نے یہ سمجھ لیا ہو کہ دعوت دین کی بنیاد اکابر کے ملفوظات ہیں تو آپ کو وہ دعوت دینی دعوت نظر نہ آئے گی جس کی بنیاد قرآن وسنت پر رکھی گئی ہو۔ اگر آپ یہ معیار قائم کرلیں کہ دین وہ ہے جو بزرگوں سے عقیدت پیدا کرے تو آپ کو وہ دین دین معلوم نہ ہوگا جو خدا سے عقیدت پیدا کرنے والا ہو۔ اگر آپ کا ذہن یہ ہو کہ کامل دین وہ ہے جو سیاسی انقلاب کا علم بردار ہو تو آپ کو وہ دین ناقص دین دکھائی دے گا جو فرد کے اندر نفسیاتی انقلاب پر زور دیتا ہو۔ اگر آپ کا خیال یہ ہو کہ جہاد اور عزیمت کے مقام پر وہ ہے جو حکمرانوں کو اقتدار سے بے دخل کرنے کے لئے اکھیڑ پچھاڑ کی مہم چلائے تو آپ کو وہ شخص جہاد اور عزیمت کے مقام سے گرا ہوا نظر آئے گا جو یہ کہے کہ حکمرانوں سے تصادم نہ کرتے ہوئے غیر سیاسی دائرہ میں کام کرو۔ اگر آپ یہ معیار بنالیں کہ جو شخص فروعی مسائل اور فنی موشگافیوں میں کمال رکھتا ہو وہی ماہر دینیات ہے تو آپ کو وہ شخص علم دینیات کا ماہر نظر نہ آئے گا جو خوف خدا اور فکر آخرت کی باریکیوں کو بیان کرتا ہو۔ اگر آپ نے یہ سمجھ لیا ہو کہ احتجاج اور حقوق طلبی کی مہم احیار ملت کی مہم ہے تو آپ ملت کے اندر خود تعمیری کی تحریک کو احیائے ملت کی تحریک سمجھنے سے قاصر رہیں گے۔

ایک سچی بات

شیخ حمید الدین ابوحاکم قریشی (۷۳۲ء ۔ ۵۰۷ھ) ایک ایسے خاندان میں پیدا ہوئے جو کیچ اور مکران کے علاقہ پر حکومت کر رہا تھا۔ اپنے والد سلطان بہاء الدین کے انتقال کے بعد وہ تخت سلطنت پر بیٹھے اور ۲۱ سال تک شان وشوکت کے ساتھ حکومت کی۔

"ذکر کرام" میں ان کے واقعات کے ذیل میں لکھا ہے کہ شیخ حمید الدین کے ساتھ ایک چھوٹا سا واقعہ پیش آیا جس نے ان کی زندگی کا رخ بدل دیا اور "سلطان کے بجائے ان کو "شیخ" بنا دیا۔

شیخ حمید الدین اپنی حکومت کے زمانہ میں دوپہر کو اپنے ایک باغ میں قیلولہ کیا کرتے تھے۔ اس باغ میں ان کا ایک محل تھا۔ اس محل کی نگرانی نونیت نامی ایک خادمہ کے سپرد تھی۔ اس خادمہ کے ذمہ یہ کام تھا کہ ہر روز وقت پر بستر بچھا دے تاکہ شیخ حمید الدین آکر اس پر آرام کر سکیں۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز شیخ کے آنے سے پہلے خادمہ نے بستر بچھایا تو اس کو بستر بہت اچھا لگا۔ وہ اس پر کچھ دیر کے لئے لیٹ گئی۔ ابھی وہ بستر سے اٹھی نہیں تھی کہ اس کو نیند آگئی۔ شیخ حمید الدین جب معمول کے مطابق آرام کرنے کے لئے محل پہنچے تو دیکھا کہ خادمہ نونیت بستر پر پڑی سو رہی ہے۔ سلطان کے بستر پر خادمہ کو سویا ہوا دیکھ کر انھیں غصہ آگیا۔ انھوں نے حکم دیا کہ اس گستاخی پر خادمہ کو سو کوڑوں کی سزا دی جائے۔

حکم کی فوراً تعمیل ہوئی اور خادمہ کو کوڑے مارے جانے لگے۔ مگر شیخ حمید الدین کو یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ خادمہ آہ و واویلا نہیں کر رہی ہے، بلکہ ہر کوڑے پر ہنس پڑتی ہے۔ انھوں نے سزا کو روک کر خادمہ کو بلایا اور اس سے خلاف معمول ہنسنے کی وجہ پوچھی۔ خادمہ نے نہایت سنجیدگی کے ساتھ جواب دیا:

> مجھے خیال آیا کہ جب اس نرم بستر پر ایک بے اختیارانہ نیند کی یہ سزا ہے تو ان لوگوں کا انجام کیا ہوگا جو روزانہ اس نرم بستر پر آرام کرتے ہیں۔

خادمہ کے اس جواب کا شیخ حمید الدین پر اتنا اثر ہوا کہ ان کی زندگی بالکل بدل گئی۔ وہ دنیا اور اس کی لذتوں سے بے رغبت ہو گئے۔ یہاں تک کہ درویشی کی زندگی اختیار کر لی۔ سلطنت چھوڑ کر شیخ حمید الدین لاہور آئے۔ یہاں حضرت سید احمد توختہ (جو ان کے نانا بھی ہوتے تھے) کی خدمت میں حاضر ہو کر ان کے ہاتھ پر طریقہ شطاریہ میں بیعت کی اور ریاضتوں اور مجاہدوں کے بعد ان کی خلافت حاصل کی۔ شیخ حمید الدین نے ۱۶۷ سال کی عمر پائی۔ آخر عمر میں وہ اُچ اور سکھر کے درمیانی علاقہ میں تبلیغ وارشاد کا کام کرتے رہے۔ اس علاقہ میں بہت سے لوگ ان کے ہاتھ پر ایمان لائے (تذکرۂ صوفیاء پنجاب از اعجاز الحق قدوسی)

آدمی کی فطرت زندہ ہو تو ایک جملہ اس کو تڑپانے کے لئے کافی ہے۔ اور اگر فطرت مردہ ہو جائے تو ہزاروں تقریریں بھی اس کو حرکت میں لانے کے لئے ناکام ثابت ہوتی ہیں۔

اصل عبادت اللہ کے آگے عاجزی کرنا ہے

عبداللہ بن جدعان زمانہ جاہلیت کے عربوں میں بڑا فیاض اور مہمان نواز آدمی تھا۔ وہ رشتہ میں حضرت عائشہ کا چچازاد بھائی تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل مر گیا۔ حضرت عائشہ نے ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: اے خدا کے رسول، عبداللہ بن جدعان لوگوں کی بہت خدمت کرتا تھا اور لوگوں کو کھانا کھلایا کرتا تھا۔ کیا قیامت کے دن ابن جدعان کا یہ عمل اس کو نفع دے گا۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ کیوں کہ اس نے کبھی یہ نہ کہا کہ رب اغفر لی خطیئتی یوم الدین (میرے رب، بدلہ کے دن میری خطاؤں کو معاف کر دے، مسلم)

خدا کو بندے کی عاجزانہ پکار پسند ہے

بندہ جب اپنے رب کو پکارتا ہے اور وہ اس کو محبوب ہوتا ہے تو وہ فرماتا ہے: اے جبریل، میرے بندے کی حاجت پوری کرنے میں جلدی نہ کر۔ مجھے محبوب ہے کہ میں اس کی آواز کو سنوں (جاء فی الآثار ان العبد اذا دعا ربہ وھو یحبہ قال: یا جبریل لا تعجل بقضاء حاجۃ عبدی فانی احب ان اسمع صوتہ ابن رجب حنبلی، جامع العلوم والحکم، مکتبۃ الریاض الحدیثۃ، قاہرہ ۱۹۶۲، صفحہ ۳۴۲)

محتاط زندگی کیسی ہوتی ہے

حضرت عمر بن عبد العزیز نے فرمایا: جس معاملہ میں ہدایت ظاہر ہو اس کی پیروی کرو۔ جس معاملہ کا نقصان ظاہر ہو اس سے بچو۔ جو معاملہ مشتبہ نظر آئے اس کو اللہ کے حوالے کر دو (امر استبان رشدہ فاتبعہ وامر استبان ضرہ فاجتنبہ وامر اشکل امرہ علیک فردہ الی اللہ)

اچھائی کا ذکر کرنا اور برائی کو چھپانا

ابو ہرون کہتے ہیں کہ میں ابو حازم کے پاس گیا اور ان سے کہا: اللہ آپ پر رحم کرے، دونوں آنکھوں کا شکر کیا ہے۔ انھوں نے کہا: جب تم اپنی آنکھوں سے اچھائی دیکھو تو اس کا تذکرہ کرو، اور جب تم اپنی آنکھوں سے برائی دیکھو تو اس کو چھپاؤ۔ پھر میں نے پوچھا کہ دونوں کانوں کا شکر کیا ہے۔ انھوں نے کہا: —— جب تم اپنے کانوں سے اچھائی سنو تو اس کو یاد کر لو اور جب تم اپنے کانوں سے برائی سنو تو اس کو بھلا دو (قال ابو ھرون، دخلت علیٰ ابی حازم فقلت لہ: یرحمک اللہ ما شکر العینین۔ قال اذا رأیت بھما خیرا ذکرتہ واذا رأیت بھما شرا استرتہ۔ قلت فما شکر الاذنین۔ قال اذا سمعت بھما خیراً حفظتہ واذا سمعت بھما شرا انسیتہ)

تین باتیں جو ہر چیز کی جامع ہیں

عن امّ انس رضی اللہ عنہا انّھا قالت یا رسول اللہ اوصنی۔ قال: اُھجُری المعاصیَ فانھا افضلُ الھجرۃ۔ وحافظی علی الفرائض فانھا

ام انس رضی اللہ عنہا بتاتی ہیں کہ انھوں نے کہا اے خدا کے رسول مجھے وصیت کیجئے۔ آپ نے فرمایا: گناہوں کو چھوڑ دو، یہ سب سے بڑی ہجرت ہے۔ فرائض کی نگہداشت

افضلُ الجہادِ واکثری من ذکراللہِ فانکَ لا تاتِینَ اللہَ بشیئٍ احبَّ الیہِ من کثرۃِ ذکرِاللہ (ترغیب وترہیب بحوالہ طبرانی)

کرو، یہ سب سے بڑا جہاد ہے۔ اللہ کو بہت زیادہ یاد کرو۔ کیونکہ تم اللہ کے پاس اس کی سب سے محبوب چیز جو لے جاسکتی ہو وہ اس کی یاد ہے۔

علم وہی ہے جو اللہ سے ڈر پیدا کرے

جبیر بن نفیر نے عوف بن مالک اشجعی کے واسطہ سے نقل کیا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آپ کے اصحاب بیٹھے ہوئے تھے۔ آپ نے آسمان کی طرف نظر کی اور فرمایا کہ وہ وقت آنے والا ہے جب کہ علم اٹھا لیا جائے گا۔ انصار میں سے ایک شخص نے کہا جس کا نام زیاد بن لبید تھا۔ اے خدا کے رسول کیا ہم سے علم اٹھا لیا جائے گا۔ حالانکہ ہمارے درمیان خدا کی کتاب ہے اور ہم اپنے بچوں اور عورتوں کو اس کی تعلیم دے رہے ہیں۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میں تم کو مدینہ کا سب سے زیادہ سمجھ دار آدمی جانتا تھا۔ کیا تم یہود کی گمراہی کو نہیں دیکھتے۔ حالاں کہ ان کے درمیان خدا کی کتاب موجود ہے۔ اس کے بعد جبیر بن نفیر کی ملاقات شداد بن اوس سے ہوئی۔ انھوں نے ان کو یہ حدیث سنائی۔ شداد بن اوس نے کہا۔ جانتے ہو علم کا اٹھ جانا کیا ہے۔ انھوں نے کہا نہیں۔ شداد نے کہا، اس کے برتن کا چلا جانا۔ (ذہاب اوعیتہ) اس کے بعد شداد نے کہا:

ھل تدری ای العلم یرفع قال قلت لا ادری قال الخشوع حتی لا یری خاشعا، ابن عبد البر جامع بیان العلم وفضلہ، جزء اول، صفحہ ۱۵۳

کیا تم جانتے ہو کون سا علم اٹھا لیا جائے گا۔ انھوں نے کہا نہیں۔ فرمایا: خشوع اٹھا لیا جائے گا۔ یہاں تک کہ تم کوئی خاشع نہ دیکھو گے۔

بے راہ ہو جانے کا خطرہ ہر ایک کے لئے ہے

عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تعمل ھذہ الامۃ برھۃ بکتاب اللہ، ثم تعمل برھۃ بسنۃ رسول اللہ، ثم تعمل بعد ذلک بالرای، فاذا عملوا بالرای ضلوا (جامع بیان العلم وفضلہ، جزء ثانی، صفحہ ۱۳۴)

نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ یہ امت ایک عرصہ تک کتاب اللہ پر عمل کرے گی۔ پھر ایک عرصہ تک اللہ کے رسول کی سنت پر عمل کرے گی۔ اس کے بعد وہ رائے پر عمل کرے گی۔ اور جب وہ رائے پر عمل کرے گی تو وہ گمراہ ہو جائے گی۔

بزرگ پرستی دھیرے دھیرے بت پرستی بن جاتی ہے

سورہ نوح میں قدیم زمانہ کے کئی بتوں کا ذکر ہے — ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر۔ اس سلسلے میں مفسر ابن جریر طبری نے محمد بن قیس کے واسطہ سے ایک روایت نقل کی ہے کہ بتوں کے یہ نام دراصل ان قوموں کے بزرگوں کے نام پر ہیں۔ یہ اللہ کے نیک بندے تھے جو حضرت آدمؑ اور حضرت نوحؑ کے درمیانی زمانہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے بہت سے معتقدین تھے جو ان کی پیروی کرتے تھے، جب ان صالحین کا انتقال ہو گیا تو ان کے معتقدین نے کہا: اگر ہم ان کی مورت بنالیں تو اس سے ہمارے شوق عبادت میں اضافہ ہو گا۔ چنانچہ انھوں نے ان صالحین

کی مورتیں بنائیں۔ اس کے بعد جب دوسری نسل آئی تو اس کو شیطان نے مزید سکھایا کہ ان کے آبا و اجداد ان مورتوں کے پاس جو عبادت کرتے تھے وہ خود انھیں بزرگوں کی عبادت ہوتی تھی جن کی یہ مورتیں ہیں اور یہی بزرگ ہیں جو بارش برساتے ہیں اور سارے کام بناتے ہیں۔ اس طرح ان میں باقاعدہ بت پرستی شروع ہوگئی (ابن کثیر، تفسیر سورہ نوح)

خدا کے قانون میں کسی کے لئے رعایت نہیں

سورہ مائدہ میں بنی اسرائیل کے تذکرہ کے تحت ارشاد ہوا ہے کہ ان میں سے جو لوگ اللہ کے اتارے ہوئے حکم کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہ کافر ہیں، وہ ظالم ہیں، وہ فاسق ہیں۔ حذیفہ رضی اللہ عنہ سے کسی نے کہا کہ سورہ مائدہ کی یہ تینوں آیتیں بنی اسرائیل کے حق میں اتری ہیں، وہ ہمارے اوپر چسپاں نہیں ہوتیں۔ یعنی یہودیوں میں سے جو شخص خدا کے اتارے ہوئے حکم سے انحراف کرے وہ کافر اور ظالم اور فاسق ہے نہ کہ ہم۔ حذیفہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: بنی اسرائیل تمھارے کتنے اچھے بھائی ہیں کہ کڑوا کڑوا سب ان کے لئے ہے اور میٹھا میٹھا سب تمھارے لئے۔ ہرگز نہیں خدا کی قسم تم انھیں کے طریقہ پر قدم بقدم چلو گے (نعم الاخوۃ لکم بنو اسرائیل ان کانت لھم کل مُرّۃ ولکم کل حلوۃ کلا واللہ لتسلکن طریقھم قدر الشراک)

جب جنت والے جنت میں جانے سے روک دیے جائیں گے

امام بخاری نے اپنی کتاب الادب المفرد (باب المعانقہ) میں نقل کیا ہے۔ عبد اللہ بن محمد بن عقیل کہتے ہیں کہ میں نے جابر بن عبد اللہ کو یہ کہتے ہوئے سنا: مجھے ایک صحابی کے بارے میں یہ بات پہنچی کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک حدیث سنی ہے۔ میں نے ایک اونٹ خریدا اور اس پر کجاوہ باندھا اور اس کے بعد اونٹ پر سوار ہو کر روانہ ہوا۔ میں ایک مہینہ تک سفر کرتا رہا۔ اس کے بعد میں شام پہنچا اور وہاں عبد اللہ بن اُنَیسؓ کے گھر پر حاضر ہوا۔ میں نے دربان سے کہا: صاحب خانہ سے کہو کہ جابر دروازہ پر ہے۔ انھوں نے کہا کیا عبد اللہ کے لڑکے جابر۔ میں نے کہا ہاں۔ پھر عبد اللہ بن اُنَیس نکلے اور مجھ کو گلے سے لگایا۔ میں نے کہا: مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ سنا ہے۔ مجھے ڈر ہوا کہ میں مرجاؤں قبل اس کے کہ میں اس کو سنوں۔ انھوں نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے ہوئے سنا ہے: قیامت کے دن لوگ اس حال میں جمع ہوں گے کہ ننگے، غیر مختون اور بے سروسامان ہوں گے۔ اللہ ان کو آواز دے گا جس کو دور والے بھی اسی طرح سنیں گے جس طرح قریب والے سنیں گے۔ اللہ فرمائے گا: میں بادشاہ ہوں، میں انصاف کرنے والا ہوں۔ کوئی جنت والا جنت میں داخل نہیں ہوسکتا اگر اس نے کسی دوزخ والے پر ظلم کیا ہو جس کا وہ بدلہ چاہتا ہو۔ اور کوئی دوزخ والا دوزخ میں داخل نہیں ہوسکتا اگر اس نے کسی دوزخ والے پر ظلم کیا ہو اور وہ اس کا بدلہ چاہتا ہو۔ میں نے پوچھا ایسا کیوں کر ہوگا جب کہ ہم کو اللہ ننگے اور بے سروسامان اٹھائے گا۔ جواب دیا: بالحسنات والسیئات۔ یعنی بھلائیوں اور برائیوں کے ذریعہ بدلا ادا کیا جائے گا۔

برائی کو روکو

ما من قوم یُعمل فیھم بالمعاصی ثم یقدرون علیٰ ان یغیروا فلم یغیروا الا یوشک ان یعمھم اللہ تعالیٰ بعقاب (ابوداؤد، ترمذی)

کسی بھی قوم میں اگر گناہ کیے جائیں اور قدرت رکھنے کے باوجود لوگ گنہ گاروں کو نہ روکیں تو قریب ہے کہ خدا ان سب کو عذاب میں مبتلا کر دے۔

والذی نفسی بیدہ لتامرن بالمعروف ولتنھون عن المنکر او لیوشکن اللہ ان یبعث علیکم عقاباً منہ ثم تدعونہ فلا یستجیب لکم (ترمذی)

اس ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے ضرور ہے کہ تم لوگ نیکی کا حکم دو اور برائی سے روو۔ ورنہ جلد ہی خدا تم سب پر عذاب بھیج دے گا۔ پھر تم خدا کو پکارو گے مگر وہ تم کو کوئی جواب نہ دے گا۔

حدیث میں اس قسم کی جو ہدایتیں نقل ہوئی ہیں وہ اصلاً سماجی ہدایتیں ہیں نہ کہ سیاسی ہدایتیں۔ یعنی ان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی حکمراں کو "ظالم" قرار دے کر اس کے خلاف شور وغل کرو اور انصاف قائم کرنے کے نام پر اس کو اقتدار سے بے دخل کرنے کی مہم چلاؤ۔ اس قسم کی اسلامی سیاست محض موجودہ زمانہ کی سیاسی پارٹیوں کی نقل ہے۔ اس کا مذکورہ اسلامی ہدایات سے کوئی تعلق نہیں۔ ان ہدایات کا مخاطب معاشرہ کا ہر فرد ہے نہ کہ کوئی سیاسی نظام۔

کسی معاشرہ میں ہمیشہ تھوڑے آدمی ہوتے ہیں جو شرارت کرتے ہیں۔ اب اگر معاشرہ ایک زندہ معاشرہ ہو تو جب لوگ دیکھتے ہیں کہ ایک پڑوسی دوسرے پڑوسی کو ستا رہا ہے۔ ایک رشتہ دار دوسرے رشتہ دار کو تکلیف دے رہا ہے۔ ایک صاحب معاملہ دوسرے صاحب معاملہ کے حقوق ادا نہیں کرتا تو ایسے معاشرہ میں مظلوم کو خود اپنے آس پاس ایسے لوگ مل جاتے ہیں جو اس کی حمایت میں کھڑے ہو جائیں۔ وہ ظالم کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ اپنی شرارتوں سے باز آئے۔ ایسے سماج میں برائیاں پیدا ہوتی ہیں مگر وہ وہیں کی وہیں دبا دی جاتی ہیں۔ اس کے برعکس جب لوگوں کا حال یہ ہو جائے کہ وہ اپنے سامنے ظلم و زیادتی کے واقعات دیکھیں مگر غیر جانب دار بن کر رہ جائیں تو دھیرے دھیرے ان خرابیوں سے ایسے فتنے ابھرتے ہیں جو پورے سماج کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔

ماحول کا دباؤ سب سے بڑا دباؤ ہے۔ حتیٰ کہ حکومت اور عدالت سے بھی زیادہ۔ اگر آس پاس کا ماحول ظالم کو روکے اور مظلوم کی حمایت میں کھڑا ہو جائے تو کبھی برائیاں پھیل نہیں سکتیں۔ اس کے برعکس جب ماحول برائی کو دیکھنے کے باوجود خاموش رہے تو بیک وقت دو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ ایک طرف ظالم کی حوصلہ افزائی اور دوسری طرف مظلوم کے اندر انتقام اور بے اعتمادی۔ یہ دونوں چیزیں وقت کے ساتھ بڑھتی رہتی ہیں۔ یہاں تک کہ وہ وقت آتا ہے کہ برائیاں بڑھ کر خود ان لوگوں کو جھلس دیتی ہیں جو اپنے کو مامون سمجھ کر ان کے معاملہ میں غیر جانب دار بن گئے تھے۔

اللہ اس کا محافظ ہے جو اللہ کا کام کرے

عائشہ رضی اللہ عنہا کہتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک رات کو میرے حجرہ میں تھے اور جاگ رہے تھے۔ میں نے پوچھا کہ کیا بات ہے۔ آپ نے فرمایا: کاش میرے اصحاب میں سے کوئی صالح آدمی رات کو میرا پہرہ دیتا۔ اتنے میں باہر سے ہتھیار کی آواز آئی۔ آپ نے پکار کر پوچھا کہ کون ہے، آواز آئی "میں سعد بن مالک ہوں" آپ نے پوچھا: کیا چیز تم کو یہاں لے آئی۔ انھوں نے جواب دیا: اے خدا کے رسول میں اس لئے آیا تاکہ آپ کے اوپر پہرہ دوں۔ حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سو گئے یہاں تک کہ میں نے آپ کے خراٹے کی آواز سنی۔ ایک اور روایت میں وہ کہتی ہیں کہ مدینہ آنے کے بعد رات کے وقت آپ پر پہرہ دیا جاتا تھا۔ یہاں تک کہ یہ آیت اتری واللہ یعصمک من الناس (مائدہ ۶۷) تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قبہ سے اپنا سر نکالا اور فرمایا: اے لوگو واپس جاؤ کیونکہ اللہ نے ہم کو اپنی حفاظت میں لے لیا ہے (یا ایھا الناس انصرفوا فقد عصمنا اللہ عز وجل، تفسیر ابن کثیر، جلد اول۔ صفحہ ۵۳۴)

حکمت اللہ کا سب سے بڑا عطیہ ہے

ابن وہب کہتے ہیں کہ میں نے امام مالک کو یہ کہتے ہوئے سنا: حکمت اور علم ایک نور ہے جس سے اللہ جس کو چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے۔ یہ بہت سے مسائل جاننے کا نام نہیں ہے (الحکمۃ والعلم نور یھدی بہ اللہ من یشاء ولیس بکثرۃ المسائل، جامع بیان العلم وفضلہ، جزء اول ۱۸)

علم کے بغیر عمل کبھی بگاڑ کا باعث ہوتا ہے

حضرت عمر بن عبد العزیز نے فرمایا: جو شخص علم کے بغیر عمل کرے گا وہ اصلاح سے زیادہ فساد پیدا کرے گا (من عمل فی غیر علم کان ما یفسد اکثر مما یصلح، جامع بیان العلم وفضلہ، جزء اول، صفحہ ۲۷)

برے سلوک پر اچھے انجام کی فال لینا

ایرانیوں سے جنگ کے زمانہ میں مسلمانوں کا ایک سفارتی وفد شاہ یزدگرد کے دربار میں گیا۔ یزدگرد نے ان سے حقارت آمیز باتیں کیں۔ اس نے کہا۔ میں نہیں جانتا کہ زمین پر کوئی قوم تم سے زیادہ بدبخت اور تعداد میں کم اور آپس میں لڑنے والی رہی ہو۔ ہم تم لوگوں کو آس پاس کے دیہاتوں کے سپرد کر دیں گے۔ وہی تمھارے لئے ہماری طرف سے کافی ہوں گے۔" مسلمانوں کی طرف سے مغیرہ بن شعبہ نے کہا: تم نے ہماری جس زبوں حالی کا ذکر کیا، وہ بالکل درست ہے۔ ہمارا مکان صرف زمین کی سطح تھی۔ ہم وہی کپڑے پہنتے تھے جو ہم اونٹوں اور بکریوں کے بالوں سے بناتے تھے۔ ہمارا دین یہ تھا کہ ہمارا بعض بعض کو قتل کر دیتا تھا اور ایک دوسرے سے بغض اور عداوت رکھتا تھا۔ ہم میں سے کوئی اپنی زندہ بیٹی کو اس اندیشہ سے دفن کر دیتا تھا کہ وہ اس کے کھانے میں سے کھائے گی۔ پھر اللہ نے ہماری طرف ایک شخص کو بھیجا جس کو ہم اچھی طرح جانتے تھے اور وہ ہم میں سب سے بہتر تھا۔ اس نے ہمارے سامنے ایک دعوت پیش کی۔ ابتداءً ہم میں سے صرف ایک شخص (ابوبکر رض) نے اس کا ساتھ دیا۔ ہم اس کی باتوں کو جھٹلاتے رہے۔

مگر اس نے جو کچھ کہا وہ ہو کر رہا (فلم یقل شیئاً الا کان) پھر اللہ نے ہمارے دلوں میں اس کی تصدیق ڈالی۔ ہم اس کے پیرو بن گئے۔ اللہ نے اپنے پیغمبر کے ذریعہ ہم سے وعدہ کیا ہے کہ ہم میں سے جو مارا جائے وہ جنت میں جائے گا اور جو باقی رہے گا اس کو مخالفین کے مقابلہ میں اللہ کی مدد حاصل ہوگی۔

یزدگرد نے خفا ہو کر اپنے آدمیوں کو حکم دیا کہ ایک ٹوکرا مٹی لاؤ اور ان میں جو سب سے زیادہ شریف ہو اس کے سر پر رکھ کر ان کو بھگا دو یہاں تک کہ وہ مدائن کی سرزمین سے باہر نکل جائیں۔ انھوں نے یہ مٹی عاصم بن عمرو کے سر پر رکھ دی۔ وہ اس کو لے کر ایرانی دربار سے نکلے اور اپنی اونٹنی پر سوار ہو کر اپنے سردار سعد بن ابی وقاصؓ تک پہنچ گئے۔ سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ کو معلوم ہوا تو انھوں نے کہا:

البشر وافقد واللہ اعطانا اللہ مقالید ملکھم (تفائلوا بذلک اخذھم بلادھم) البدایہ والنہایہ جلد ۷، صفحہ ۴۱

خوش ہو جاؤ۔ خدا کی قسم اللہ نے ان کے ملک کی کنجیاں ہم کو دے دیں۔

حق کی مخالفت کرنے والوں کے دل میں مرعوبیت ڈال دی جاتی ہے

جنگ یرموک کے زمانہ کا واقعہ ہے۔ جرجہ نام کا ایرانی سردار اپنے لشکر سے باہر آیا اور خالد بن ولید رضی اللہ عنہ سے ملاقات کی خواہش ظاہر کی۔ خالد بن ولید رضؓ بھی نکلے اور جرجہ کے اتنے قریب پہنچ گئے کہ دونوں کے گھوڑوں کی گردنیں مل گئیں۔ جرجہ نے کہا اے خالد! مجھے بتاؤ اور بالکل سچ بولو۔ کیونکہ آزاد آدمی جھوٹ نہیں بولتا۔ کیا اللہ نے تمہارے پیغمبر پر آسمان سے کوئی تلوار اتاری ہے اور وہ تلوار انھوں نے تم کو دے دی ہے۔ اب تم جس کے اوپر بھی حملہ کرتے ہو اس کو شکست دے دیتے ہو۔ خالد رضؓ نے کہا نہیں۔ جرجہ نے کہا پھر تم کو سیف اللہ کیوں کہا جاتا ہے۔ خالد رضؓ نے کہا: اللہ نے ہمارے درمیان اپنا پیغمبر بھیجا۔ ہم میں سے کچھ لوگوں نے اس کو مانا، کچھ نے جھٹلایا۔ میں جھٹلانے والوں میں تھا۔ پھر اللہ نے ہمارے دلوں اور پیشانیوں کو اپنی گرفت میں لے لیا ہم کو ہدایت دی اور ہم نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لی:

فقال لی انت سیف من سیوف اللہ سلہ اللہ علی المشرکین ودعا لی بالنصر فسمیت سیف اللہ بذلک (البدایہ والنہایہ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میری بابت فرمایا کہ تم اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہو جس کو اللہ نے مشرکین کے اوپر نکالا ہے اور آپ نے میرے لئے نصرت کی دعا فرمائی۔ اس وقت سے میرا نام سیف اللہ پڑ گیا۔

بندوں کی مدد کرنے والا کبھی خدا کی مدد سے محروم نہیں ہوتا

۶۱۰ء کی ایک شب کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم غار حرا میں تھے۔ خدا کا فرشتہ آیا اور کہا کہ "پڑھ"۔ آپ نے جواب دیا ما انا بقاری (میں پڑھا نہیں ہوں) آپ فرماتے ہیں کہ فرشتہ نے مجھ کو پکڑا اور دبایا۔ یہاں تک کہ اس کا دباؤ میری طاقت کی انتہا کو پہنچ گیا۔ پھر اس نے مجھے چھوڑ دیا اور کہا "پڑھ"، میں نے پھر کہا کہ میں پڑھا نہیں ہوں، اس نے مجھے پکڑا اور دوبارہ اس طرح دبوچا کہ اس کا دبوچنا میری طاقت کی انتہا کو پہنچ گیا۔ پھر اس نے

مجھے چھوڑ دیا اور کہا کہ "پڑھ" میں نے کہا کہ میں پڑھا نہیں ہوں۔ اس نے تیسری بار یہی عمل کیا اور کہا:

اِقرأ باسم ربك الذی خلق۔ خلق الانسان من علق۔ اقرأ وربك الاکرم	پڑھ اپنے رب کے نام سے جس نے انسان کو پیدا کیا جمے ہوئے خون سے۔ پڑھ اور تیرا رب بڑا کریم ہے۔

یہ قرآن کی پہلی آیت تھی جو آپ پر اتری۔ اس کے بعد آپ اپنی بیوی خدیجہ بنت خویلد کے پاس مکہ آئے۔ اس وقت آپ کا دل کانپ رہا تھا۔ آپ نے کہا زملونی زملونی (مجھے کمل اڑھاؤ، مجھے کمبل اڑھاؤ) گھر والوں نے آپ کو اڑھا کر لٹا دیا۔ جب آپ کی دہشت کم ہوئی تو آپ نے اپنی سن رسیدہ بیوی خدیجہ سے پوری کیفیت بیان کی اور کہا کہ یہ واقعہ اتنا سخت تھا کہ مجھے اپنی جان کا خطرہ پیدا ہو گیا۔ خدیجہ نے کہا:

کلا واللہ ما یخزیك اللہ ابدا۔ انك لتصل الرحم وتحمل الکل وتکسب المعدوم وتقری الضیف وتعین علی نوائب الحق	ہرگز نہیں۔ خدا کی قسم اللہ آپ کو کبھی رسوا نہ کرے گا۔ آپ رشتہ داروں کے حقوق ادا کرتے ہیں کمزوروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ بے سہارا لوگوں کو کمانے کے قابل بناتے ہیں۔ مہمان نوازی کرتے ہیں اور مصیبت کے وقت لوگوں کی مدد کرتے ہیں

ایمان آدمی کے اندر فراست پیدا کرتا ہے

عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے مکہ سے مدینہ کے لئے ہجرت کی تو ان کے ساتھ عیاش بن ابی ربیعہ بھی تھے۔ یہ لوگ مدینہ پہنچ کر بنی عمرو بن عوف کے یہاں ٹھہرے۔ ابو جہل بن ہشام اور حارث بن ہشام اس کے بعد عیاش کی کھوج میں نکلے۔ وہ دونوں ان کے قریبی رشتہ دار تھے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابھی مکہ میں تھے۔ وہ دونوں مدینہ پہنچے اور عیاش سے ملے اور ان سے باتیں کیں۔ انھوں نے عیاش سے کہا: تمھاری ماں نے قسم کھائی ہے کہ اس کے سر کو کنگھی نہ چھوئے گی اور نہ وہ دھوپ سے سایہ میں آئے گی جب تک تم کو دیکھ نہ لے۔" یہ باتیں سن کر عیاش کو اپنی ماں پر رحم آگیا۔ عمر رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا: یہ لوگ تم کو تمھارے دین سے پھیر دینا چاہتے ہیں اس لئے تم ان سے بچ کر رہو:

فواللہ لو قد آذی امك القمل لامتشطت ولو قد اشتد علیها حر مکة لاستظلت	خدا کی قسم جب تمھاری ماں کو جوں کاٹے گی تو ضرور وہ کنگھی کرے گی اور جب اس کو مکہ کی گرمی ستائے گی تو ضرور وہ سایہ میں جائے گی۔

(البدایہ والنہایہ جلد ۳)

عیاش نے کہا میں چاہتا ہوں کہ ماں کو اس کی قسم سے بری کر دوں اور وہاں میرا مال ہے اس کو بھی لے لوں۔ پھر واپس آجاؤں گا۔ چنانچہ وہ مکہ کے لئے روانہ ہو گئے۔ وہاں ان کے رشتہ داروں نے ان کو رسی میں باندھ دیا اور طرح طرح سے تکلیف دینا شروع کیا۔ یہاں تک کہ وہ اسلام کو چھوڑ کر اپنے آبائی دین میں واپس چلے گئے۔

خدا کی رحمت وہی پاتا ہے جو خود بھی رحمت کرے

رسول اللہ صلعم نے فرمایا: جو انسانوں پر رحم نہ کرے، اللہ بھی اس پر رحم نہیں کرتا (من لا یرحم الناس لا یرحمہ اللہ)

ایجنسی : ایک تعمیری اور دعوتی پروگرام

الرسالہ عام معنوں میں صرف ایک پرچہ نہیں، وہ تعمیر ملت اور احیار اسلام کی ایک مہم ہے جو آپ کو آواز دیتی ہے کہ آپ اس کے ساتھ تعاون فرمائیں۔ اس مہم کے ساتھ تعاون کی سب سے آسان اور بے ضرر صورت یہ ہے کہ آپ الرسالہ کی ایجنسی قبول فرمائیں۔

"ایجنسی" اپنے عام استعمال کی وجہ سے کاروباری لوگوں کی دلچسپی کی چیز سمجھی جانے لگی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ ایجنسی کا طریقہ دور جدید کا ایک مفید عطیہ ہے جس کو کسی فکر کی اشاعت کے لئے کامیابی کے ساتھ استعمال کیا جاسکتا ہے۔ کسی فکری مہم میں اپنے آپ کو شریک کرنے کی یہ ایک انتہائی ممکن صورت ہے اور اسی کے ساتھ اس فکر کو پھیلانے میں اپنا حصہ ادا کرنے کی ایک بے ضرر تدبیر بھی۔

تجربہ یہ ہے کہ بیک وقت سال بھر کا زر تعاون روانہ کرنا لوگوں کے لئے مشکل ہوتا ہے۔ مگر پرچہ سامنے موجود ہو تو ہر مہینے ایک پرچہ کی قیمت دے کر وہ بآسانی اس کو خرید لیتے ہیں۔ ایجنسی کا طریقہ اسی امکان کو استعمال کرنے کی ایک کامیاب تدبیر ہے۔ الرسالہ کی تعمیری اور اصلاحی آواز کو پھیلانے کی بہترین صورت یہ ہے کہ جگہ جگہ اس کی ایجنسی قائم کی جائے۔ بلکہ ہمارا ہر ہمدرد اور متفق اس کی ایجنسی لے۔ یہ ایجنسی گویا الرسالہ کو اس کے متوقع خریداروں تک پہنچانے کا ایک کارگر درمیانی وسیلہ ہے۔

وقتی جوش کے تحت لوگ ایک "بڑی قربانی" دینے کے لئے بآسانی تیار ہو جاتے ہیں۔ مگر حقیقی کامیابی کا راز ان چھوٹی چھوٹی قربانیوں میں ہے جو سنجیدہ فیصلہ کے تحت لگاتار دی جائیں۔ ایجنسی کا طریقہ اس پہلو سے بھی اہم ہے یہ ملت کے افراد کو اس کی مشق کراتا ہے کہ ملت کے افراد چھوٹے چھوٹے کاموں کو کام سمجھنے لگیں۔ ان کے اندر یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ مسلسل عمل کے ذریعہ نتیجہ حاصل کرنا چاہیں نہ کہ یکبارگی اقدام سے۔

ایجنسی کی صورتیں

پہلی صورت ——— الرسالہ کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں پر دی جاتی ہے۔ کمیشن ۲۵ فی صد ہے۔ پیکنگ اور روانگی کے اخراجات ادارہ الرسالہ کے ذمہ ہوتے ہیں۔ مطلوبہ پرچے کمیشن وضع کرکے بذریعہ وی پی روانہ کئے جاتے ہیں۔ اس اسکیم کے تحت ہر شخص ایجنسی لے سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس کچھ پرچے فروخت ہونے سے رہ گئے ہیں تو اس کو پوری قیمت کے ساتھ واپس لے لیا جائے گا بشرطیکہ پرچے خراب نہ ہوئے ہوں۔

دوسری صورت ——— الرسالہ کے پانچ پرچوں کی قیمت بعد وضع کمیشن ساڑھے سات روپیہ ہوتی ہے۔ جو لوگ صاحب استطاعت ہیں وہ اسلامی خدمت کے جذبہ کے تحت اپنی ذمہ داری پر پانچ پرچوں کی ایجنسی قبول فرمائیں۔ خریدار ملیں یا نہ ملیں، ہر حال میں پانچ پرچے منگوا کر ہر ماہ لوگوں کے درمیان تقسیم کریں۔ اور اس کی قیمت خواہ سالانہ نوے روپے یا ماہانہ ساڑھے سات روپے دفتر الرسالہ کو روانہ فرمائیں۔

عصری اسلوب میں اسلامی لٹریچر

۱-	الاسلام		از مولانا وحید الدین خاں			۱۵ —۰
۲-	مذہب اور جدید چیلنج	..	〃	..		۱۵ —۰
۳-	ظہور اسلام	..	〃	..		۱۵ —۰
۴-	دین کیا ہے	..	〃	..		۲ —۰
۵-	قرآن کا مطلوب انسان	..	〃	..		۵ —۰
۶-	تجدید دین	..	〃	..		۳ —۰
۷-	اسلام دین فطرت	..	〃	..		۳ —۰
۸-	تعمیر ملت	..	〃	..		۲ —۰
۹-	تاریخ کا سبق	..	〃	..		۳ —۰
۱۰-	مذہب اور سائنس	..	〃	..		۵ —۰
۱۱-	عقلیات اسلام	..	〃	..		۳ —۰
۱۲-	فسادات کا مسئلہ	..	〃	..		۲ —
۱۳-	انسان اپنے کو پہچان	..	〃	..		۱ —۰
۱۴-	تعارف اسلام	..	〃	..		۲ —۵۰
۱۵-	اسلام پندرھویں صدی میں	..	〃	..		۲ —۰
۱۶-	راہیں بند نہیں	..	〃	..		۳ —۰
۱۷-	دینی تعلیم	..	〃	..		۳ —
۱۸-	ایمانی طاقت	..	〃	..		(زیر طبع)
۱۹-	اتحاد ملت	..	〃	..		
۲۰-	سبق آموز واقعات	..	〃	..		
۲۱-	اسلامی تاریخ سے	..	〃	..		
۲۲-	قال اللہ	..	〃	..		
۲۳-	اسلامی دعوت	..	〃	..		۳ —۰۰
۲۴-	زلزلۂ قیامت	..	〃	..		۴ —۰۰
۲۵-	سچا راستہ	..	〃	..		۱ —۰۰

1980ء میں ہم نے
جو بُنیادیں ڈالی تھیں
آیئے ، 1981ء میں
اُن پر عمارت تعمیر کریں

1980ء میں سرپٹ بھاگتے سکّے کے پھیلاؤ کو روکا گیا اور کوئلے، بجلی، صنعتی اشیاء نیز اناج کی پیداوار میں خاطر خواہ اضافہ کیا گیا۔

اب وقت ہے کہ ان فائدوں کو مضبوط کریں اور اس سے پیشتر کہ سماج کا کوئی طبقہ قومی خزانے میں سے زیادہ حصّہ طلب کرے پیداوار کو مزید بڑھائیں۔

سخت محنت اور خود پر قابو
ہمارا مقولہ ہونا چاہیے

davp 80/454

ثانی اشتیاق خاں پرنٹر پبلشر مسئول نے جے کے آفسٹ پرنٹرز دہلی سے چھپوا کر دفتر الرسالہ جمعیۃ بلڈنگ قاسم جان اسٹریٹ سے شائع کیا

REGD. NO. D. (DN) 532
REGD. R. N. NO. 28822/76

APRIL 1981
ISSUE NO. 53

AL-RISALA MONTHLY

JAMIAT BUILDING QASIMJAN STREET DELHI-110006 (INDIA) PHONE 232231

۷۰ سال سے
لوگوں کا من پسند
شربت

شربت رُوح افزا ۷۰ سالوں سے لوگوں کو گرمی کے
دنوں میں ٹھنڈک اور تراوٹ پہنچاتا آرہا ہے۔
یہ بدن کو قدرتی تازگی دینے والی سولہ جڑی بوٹیوں
اور پھولوں پھلوں کے خالص رس سے بنتا ہے
شربت رُوح افزا پیاس ہی نہیں بجھاتا بلکہ
آپ کے جسم کو گرمی کا
مقابلہ کرنے کی طاقت دیتا ہے۔
اِسے آپ چینی کی جگہ ٹھنڈے پانی،
دودھ یا دہی کی لسی اور آئس کریم میں ڈالیے اور
بھرپور فرحت بخش لذت حاصل کیجیے۔

شربت رُوح افزا
لاجواب چیز ہے

ہمدرد

HD-HWL-6741